# آتشِ گُل

## جگر مرادآبادی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

# آتشِ گُل

# آتشِ گُل

جگر مراد آبادی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Aatish-e-Gul
by
Jigar Moradabadi
Rs.100/-
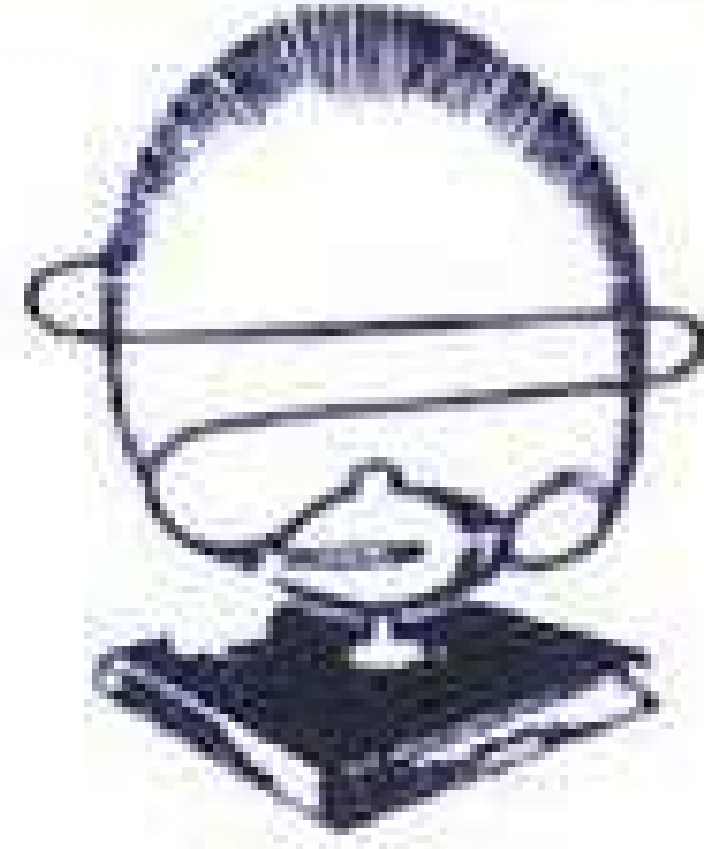
## صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

## شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔ 110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔ 400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ 202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/100 روپے
ISBN :978-81-7587-810-5 سلسلۂ مطبوعات: 1596

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

# چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیر نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

# انتساب

میرے احباب میری زندگی میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں اور میری خواہش تھی کہ میں ان سب کے خلوص، محبت اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "آتشِ گُل" کا انتساب ان کے ناموں سے کروں۔ مگر ایک ایڈیشن اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو دوسرے ایڈیشنوں میں بھی اس فرض کو ادا کروں گا۔ ورنہ میرے احباب مجھے معذور تصور فرمالیں۔

اس ایڈیشن کا انتساب مرحومین میں مرشدی و مولائی الحاج قاضی سید عبدالغنی شاہ صاحب، بنگلوری رحمۃ اللہ علیہ اور والد مرحوم مولوی علی نظر صاحب اور اُستاذی حضرت رسا مرحوم شکوہ آبادی اور اقبال سہیل مرحوم اور رضا علی وحشت مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم اور صہبا مراد آبادی مرحوم کے نام اور

معاصرین میں اپنے دیرینہ کرم فرما اور مخلصینِ خاص میں سے ڈاکٹر
ذاکر حسین خاں، پروفیسر رشید احمد صدّیقی، پروفیسر آلِ احمد سرورؔ،
سیّد فضل احمد کریم فضلی، حضرت تسکینؔ قریشی، حضرت میکشؔ اکبرآبادی،
فیض احمد فیضؔ، مرزا احسان احمد، سیّد صدّیق حسن، آنند نرائن ملاؔ،
حبیب احمد صدّیقی اور ماہر القادری صاحبان کے ناموں سے
کرتا ہوں۔

جگرؔ

گونڈہ، ۲۸ر مئی ۱۹۵۸ء

# عرضِ ناشر

حضرت جگرؔ مرادآبادی کا پہلا مختصر مجموعہ "داغِ جگر" ۱۹۲۸ء میں اعظم گڑھ سے شایع ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں "شعلۂ طور" کے نام سے مکتبہ جامعہ نے دوسرا مجموعہ شایع کیا۔ اس میں "داغِ جگر" کا کلام بھی شامل تھا۔ "شعلۂ طور" کا دوسرا ایڈیشن پاکستان میں ادارۂ نقوش لاہور نے شایع کیا۔ ہندوستان میں اس کا کوئی قابلِ ذکر ایڈیشن نہیں شایع ہوا۔ البتہ ایک ناشر نے جگرؔ صاحب کی اجازت کے بغیر اسے چھاپ لیا۔ جگرؔ صاحب اس غیر قانونی اور گھٹیا طباعت پر بہت جزبز ہوئے مگر ان کی فطری سادگی نے اس کے خلاف کسی اقدام سے انھیں باز رکھا۔

"آتشِ گل" جگرؔ صاحب کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن پاکستان میں ۱۹۵۴ء میں اشاعت پذیر ہوا اور ہندوستان

میں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے اہتمام سے شایع ہوا۔ اس اشاعت پر مصنف کو پانچ ہزار روپے کا ساہتیہ اکادمی انعام بھی عطا ہوا۔

جگرؔ صاحب کے انتقال کے بعد جگرؔ ٹرسٹ کا قیام عمل میں آیا جس نے کلام جگرؔ کے جملہ حقوق ایک باضابطہ معاہدے کے تحت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کو دے دیے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ اِن غزلوں کے اضافے کے بعد جو "آتشِ گل" کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد کہی گئی تھیں، "آتشِ گل" کا یہ ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ اربابِ ذوق اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

ہر حقیقت کو بانداز تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا

جستجو میں تری یہ حاصلِ سودا دیکھا
ایک اِک ذرّے کا آغوشِ طلب وا دیکھا

آئینہ خانۂ عالم میں کہیں کیا دیکھا
تیرے دھوکے میں خود اپنا ہی تماشا دیکھا

ہم نے ایسا نہ کوئی دیکھنے والا دیکھا
جو یہ کہہ دے کہ ترا حسنِ سراپا دیکھا

دلِ آگاہ میں کیا کہیے جگرؔ کیا دیکھا
لہریں لیتا ہوا اِک قطرے میں دریا دیکھا

کوئی شائستہ و شایانِ غمِ دل نہ ملا
ہم نے جس بزم میں دیکھا اسے تنہا دیکھا

یادش بخیر جب وہ تصور میں آگیا
شعر و شباب و حسن کا دریا بہا گیا

جب عشق اپنے مرکزِ اصلی پہ آگیا
خود بن گیا حسین، دو عالم پہ چھا گیا

جو دل کا راز تھا اُسے کچھ دل ہی پا گیا
وہ کر سکے بیاں، نہ ہمیں سے کہا گیا

ناصح فسانہ اپنا ہنسی میں اُڑا گیا
خوش فکر تھا کہ صاف یہ پہلو بچا گیا

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

دل بن گیا نگاہ، نگہ بن گئی زباں
آج اِک سکوتِ شوق قیامت ہی ڈھا گیا

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

کوئی جیتا کوئی مرتا ہی رہا
عشق اپنا کام کرتا ہی رہا

جمع خاطر کوئی کرتا ہی رہا
دل کا شیرازہ بکھرتا ہی رہا

غم وہ میخانہ، کمی جس میں نہیں
دل وہ پیمانہ کہ بھرتا ہی رہا

حُسن تو تھک بھی گیا لیکن یہ عشق
کارِ معشوقانہ کرتا ہی رہا

وہ مٹاتے ہی رہے لیکن یہ دل
نقش بن بن کر اُبھرتا ہی رہا

دھڑکنیں دل کی سبھی کچھ کہہ گئیں
دل کو میں خاموش کرتا ہی رہا

تم نے نظریں پھیر لیں تو کیا ہوا
دل میں اک نشتر اُترتا ہی رہا

گدازِ عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا
وہی ہے آگ مگر آگ میں دھواں نہ رہا

نہیں کہ دل مرا وقفِ غمِ نہاں نہ رہا
مگر وہ شیوۂ فرسودۂ بیاں نہ رہا

نہ ہے وہ شوق جو پابندِ این و آں نہ رہا
خوشا وہ سجدہ جو محدودِ آستاں نہ رہا

حجابِ عشق کو اے دل بہت غنیمت جان
رہے گا کیا جو یہ پردہ بھی درمیاں نہ رہا

چمن تو برقِ حوادث سے ہو گیا محفوظ
مری بلا سے اگر میرا آشیاں نہ رہا

جنونِ سجدہ کی معراج ہے یہی شاید
کہ تیرے در کے سوا کوئی آستاں نہ رہا

کمالِ قرب بھی شاید ہے عینِ بُعد جگرؔ
جہاں جہاں وہ ملے میں وہاں نہ رہا

دل کو سکون، رُوح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

جب کوئی ذکرِ گردشِ ایام آگیا
بے اختیار لب پہ ترا نام آگیا

غم میں بھی ہے سُرور، وہ ہنگام آگیا
شاید کہ دَورِ بادۂ گلفام آگیا

دیوانگی ہو، عقل ہو، اُمید ہو کہ یاس
اپنا وہی ہے وقت پہ جو کام آگیا

دل کے معاملات میں ناصح شکست کیا
سَو بار حُسن پر بھی یہ الزام آگیا

صیّاد شادماں ہے، مگر یہ تو سوچ لے
میں آگیا کہ سایہ تہِ دام آگیا

دل کو نہ پوچھ معرکۂ حُسن و عشق میں
کیا جانیے غریب کہاں کام آگیا

یہ کیا مقامِ عشق ہے ظالم کہ اِن دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آگیا

احباب مجھ سے قطعِ تعلّق کریں جگر
اب آفتابِ زیست لبِ بام آگیا

شعر و نغمہ، رنگ و نکہت، جام و صہبا ہو گیا
زندگی سے حسن نکلا اور رسوا ہو گیا

اور بھی آج اور بھی ہر زخم گہرا ہو گیا
بس کر اے چشمِ پشیماں کام اپنا ہو گیا

اس کو کیا کیجے زبانِ شوق کو چپ لگ گئی
جب یہ دل شائستۂ عرضِ تمنا ہو گیا

اپنی اپنی وسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے
جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا

ہم نے سینے سے لگایا دل نہ اپنا بن سکا
مسکرا کر تم نے دیکھا دل تمہارا ہو گیا

میں نے جس بت پر نظر ڈالی جنونِ شوق میں
دیکھتا کیا ہوں وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا

اٹھ سکا ہم سے نہ بارِ التفاتِ ناز بھی
مرحبا وہ، جس کو تیرا غم گوارا ہو گیا

وہ چمن میں جس روش سے ہو کے گزرے بے نقاب
دفعتاً ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا

شش جہت آئینۂ حسنِ حقیقت ہے جگر
قیس دیوانہ تھا، محوِ روئے لیلیٰ ہو گیا

روبروئے دوست ہنگامِ سلام آہی گیا
رخصت اے دیر و حرم، دل کا مقام آہی گیا

منتظر کچھ رند تھے جس کے وہ جام آہی گیا
باش اے گردوں کہ وقتِ انتقام آہی گیا

ہر نفس خود بن کے میخانہ بجام آہی گیا
توبہ جس سے کانپتی تھی وہ مقام آہی گیا

اللہ اللہ یہ مری ترکِ طلب کی وسعتیں (قطعہ)
رفتہ رفتہ سامنے حُسنِ تمام آہی گیا

اوّل اوّل ہر قدم پر تھیں ہزاروں منزلیں
آخر آخر اک مقامِ بے مقام آہی گیا

---

التفاتِ چشمِ ساقی کی سُبک تابی نہ پوچھ
میں یہ سمجھا جیسے مجھ تک دورِ جام آہی گیا

عشق کو تھا کب سے اپنی خشک دامانی کا رنج
ناگہاں آنکھوں کو اشکوں کا سلام آہی گیا

ہر نگہ پر بندشیں، اِک اِک نفس کی پرسشیں
ہوشیار اے عشق، وہ نازک مقام آہی گیا

اہلِ دُنیا اور کُفرانِ زمانہ تابہ کے
خود زمانہ بن کے تیغِ بے نیام آہی گیا

شوق نے ہر چند صدہا تفرقے ڈالے مگر
زندگی کو راس دردِ ناتمام آہی گیا

صحبتِ رنداں سے واعظ کچھ نہ حاصل کر سکا
بہکا بہکا سا مگر طرزِ کلام آہی گیا

بے جگر سونا پڑا تھا مُدتوں یہ میکدہ
پھر وہ دریا نوش رندِ تشنہ کام آہی گیا

پرائے ہاتھوں جینے کی ہوس کیا
نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

مکان و لامکاں سے بھی گزر جا
فضائے شوق میں پروازِ خس کیا

کرم صیاد کے صد ہا ہیں، پھر بھی
فراغِ خاطرِ اہلِ قفس کیا

محبت سر فروشی، جاں سپاری
محبت میں خیالِ پیش و پس کیا

اجل خود زندگی سے کانپتی ہے
اجل کی زندگی پر دسترس کیا

زمانے پر قیامت بن کے چھا جا
بنا بیٹھا ہے طوفاں در نفس کیا

قفس سے ہے اگر بیزار بلبل
تو پھر یہ شغلِ تزئینِ قفس کیا

لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک
نہ آئے گی بہار اب کی برس کیا

یک لحظہ خوشی کا جب انجام نظر آیا
شبنم کو ہنسی آئی ڈل غنچوں کا بھر آیا

یہ کون تصوّر میں ہنگامِ سحر آیا
محسوس ہوا جیسے خود عرش اُتر آیا

خیر اس کو نظر آیا، شر اس کو نظر آیا
آئینے میں خود عکسِ آئینہ نظر آیا

اس بزم سے دل لے کر کیا آج اثر آیا
ظالم جسے سمجھے تھے مظلوم نظر آیا

اُس جانِ تغافل نے پھر یاد کیا شاید
پھر عہدِ محبّت کا ہر نقش اُبھر آیا

گلشن کی تباہی پر کیوں رنج کرے کوئی
الزام جو آنا تھا، دیوانوں کے سر آیا

یہ محفلِ ہستی بھی کیا محفلِ ہستی ہے
جب کوئی اُٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا

کچھ رات رہے ساقی جو اُٹھا کہتا ہوا ہر میخوار اُٹھا
کیا بات ترے میخانے کی، جو رند اٹھا ہُشیار اُٹھا

مطرب! وہ کہاں اب بزمِ طرب، تکلیفِ رہِ پُرخار اُٹھا
ساقی یہ زمانِ عیش نہیں، شیشہ نہ اُٹھا، تلوار اُٹھا

شاعر کو تھا جس کا اندیشہ وہ فتنہ بھی آخر کار اُٹھا
اِک طیش میں ہر مظلوم بڑھا، اِک غیظ میں ہر فن کار اُٹھا

کچھ اپنی گرہ سے کھو کر ہی اس بزم سے دل ناچار اُٹھا
حالاں کہ بہت بیدار رہا، ہر چند بہت ہُشیار اُٹھا

کوئی نہ اٹھا میخانے سے شائستۂ میخانہ بن کر
یہ مستِ شرابِ عجز اُٹھا، وہ مستِ مئے پندار اُٹھا

زنداں میں تو مجھ کو ڈال دیا، اے حاکمِ زنداں تو نے مگر
پرواز مری جو روک سکے، ایسی بھی کوئی دیوار اُٹھا

بے کار نہیں، بے وجہ نہیں، یہ کشمکشِ تمکین و جنون
اے گوشہ نشینِ خلوتِ دل، کچھ لطف سرِ بازار اُٹھا

کیا جانیے کیا ہے اس کی طلب، کھلتا ہی نہیں کچھ اس کا سبب
اِس بزم سے دل خاموش اُٹھا، مغموم اُٹھا، بے زار اُٹھا

یہ عہدِ خرد ہے عہدِ خرد، یاں عشق و جنوں کا ذکر ہی کیا
اے واعظِ ناداں ہوش میں آ، تقریر نہ کر دستار اُٹھا

یہ رزم گہِ ہستی ہے جگرؔ، یاں عشق کی صحت لازم ہے
کیا اس کی حیات و مرگ کہ جو، بیمار جیا، بیمار اُٹھا

تیرا تصور شب ہمہ شب
خلوتِ غم بھی بزمِ طرب

دعوئ عشق اور شکوہ بہ لب
شرم! دلِ آرام طلب

باتیں ہیں دو، مقصود ہے ایک
تیری طلب یا اپنی طلب

آ ہی گیا اک مستِ شباب
شیشہ بدست و نغمہ بہ لب

حسنِ مکمل، جذب و گریز
عشقِ مسلسل ترک و طلب

بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ
ہجر کی شب اور آخرِ شب

ترکِ طلب اور اطمینان
دیکھ تو میرا حسنِ طلب

ہائے وہ دردِ دل کہ جگرؔ
کچھ نہیں کھلتا جس کا سبب

سینے میں اگر ہو دلِ بیدارِ محبت
ہر سانس ہے پیغمبرِ اسرارِ محبت

وہ بھی ہوئے جاتے ہیں طرفدارِ محبت
اچھے نظر آتے نہیں آثارِ محبت

ہشیار ہو اے بےخود و سرشارِ محبت
اظہارِ محبت! ارے اظہارِ محبت

تا دیر نہ ہو دل بھی خبردارِ محبت
اک یہ بھی ہے اندازِ فسوں کارِ محبت

توہینِ نگاہِ کرمِ یار کہاں تک
دم لینے دے اے لذتِ آزارِ محبت

سب پھونک دیے خار و خسِ مذہب و ملت
اللہ رے اک شعلۂ رخسارِ محبت

کونین سے کیا اہلِ محبت کو سروکار
کونین ہے خود غاشیہ بردارِ محبت

جو عرش کی رفعت کو بھی اس در پہ جھکا دے
ایسا بھی کوئی سجدۂ سرشارِ محبت

میں نے انھیں تاریک فضاؤں میں بھی اکثر
دیکھے ہیں برستے ہوئے انوارِ محبت

ناصح کو ہے کیوں میری محبت سے سروکار
چہرے سے تو کھلتے نہیں آثارِ محبت

میں اور یہ تمکینِ غمِ عشق! ارے توبہ
تو اور یہ احساسِ گرانبارِ محبت

اب عرضِ محبت کی جگر کیوں نہیں جرأت
وہ سامنے ہیں گرم ہے بازارِ محبت

غم ہی کیا زینۂ صفات و ذات
غم نہیں ہے تو آرزو نہ حیات

نغمۂ آرزو و رقصِ حیات
مرحبا عاشقانِ خوش اوقات

تو محبّت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

ہم نے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دل
ہم سے پوچھو ستم کے احسانات

آرزو ہر نفس حیات و مرگ
عاشقی بے نیازِ مرگ و حیات

باتوں باتوں میں آج تو سرِ بزم
کہہ گئے وہ ہر ایک دل کی بات

آپ جو کچھ کہیں بجا، لیکن
آپ پر بھی ہیں چند الزامات

حُسن ہی حُسن، جلوہ ہی جلوہ
اللہ اللہ، ہجومِ کیفیّات

عشق وہ تشنہ کام ہی کہ جسے
زہر کا گھونٹ بھی ہی آبِ حیات

اے کمالِ سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اِک بات

دُنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

میں شکوہ بہ لب تھا، مجھے یہ بھی نہ رہا یاد
شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے
اب تک ہے وہ اِک نغمۂ بے ساز و صدا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش
اُس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

مُدّت ہوئی اِک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

ہاں ہاں، تجھے کیا کام مری شدّتِ غم سے
ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہَوا یاد

میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

حسینِ دل، متبسم نگاہ پیدا کر
پھر اک لطیف سی خاموش آہ پیدا کر

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ اک شمعِ راہ پیدا کر

خلوصِ عشق و یقینِ حیات کے ہمراہ
جنونِ شوق و فسونِ نگاہ پیدا کر

رگوں میں بھر کے فروغِ جمالِ اِلّا اللہ
نظر میں شعلگیِ لا اِلٰہ پیدا کر

یہی زمیں ترا مسکن، یہی ترا مدفن
اسی زمین سے تو مہر و ماہ پیدا کر

شاہد و ساقی و بہار سے دُور
یعنی ہر کیفِ مستعار سے دُور

تخت سے، تاج و تاجدار سے دُور
دُور اس دَورِ فتنہ کار سے دُور

ہے خزاں اپنی ہر خزاں سے جُدا
ہے بہار اپنی ہر بہار سے دُور

ستم و جورِ آسماں سے الگ
کرم و لطفِ غمگسار سے دُور

## قطعہ

خطرۂ موت اب نہ فکرِ حیات
نشہ ہی نشہ ہے خمار سے دُور

پرتوِ حسنِ ذات سے نزدیک
سایۂ زلفِ تابدار سے دُور

اِک حقیقت، خیال سے برتر
اِک جہاں چشمِ روزگار سے دُور

عشق ہے اُس مقام پر کہ جہاں
حسن ہے نقشِ اعتبار سے دُور

نغمہ ترا نفس نفس، جلوہ ترا نظر نظر
بن گئی مستقل عذاب جانِ خرابِ شوق پر

تیرا خلوصِ دلبری، جان نہ ڈال دے اگر
معرفتِ جمال میں کام نہ آئے بال و پر

باہمہ ذوقِ آگہی، ہائے رے پستیٔ بشر
دیکھا ہے اک جہانِ خاص میں نے کبھی کبھی جگر

شورشِ درد، الاماں! گردشِ دہر، الحذر!
آ، مری جانِ انتظار، آ مرے آفتابِ شوق

عرضِ نیازِ عشق کا چاہیے اور کیا صلہ
لاکھ بیانِ دردِ دل، اِک وہ تبسمِ حزیں

مجھ سے کسی کو کام کیا، میرا کہیں قیام کیا
حسن سے جو نہ ہو سکا، کر گئی حسن کی اک آہ

اے مرے شاہدِ حیات اور ابھی قریب تر
خود مری کاوشِ نگاہ، خود مری فکر پردہ در

نالہ بھی میرا مضمحل، نغمہ بھی میرا بے اثر
عقل کہیں پہ گر پڑی، چھوٹ گئی کہیں نظر

سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر
حسن سے بھی بلند تر، عشق سے بھی لطیف تر

بھٹکے ہوئے سے قافلے، سہمی ہوئی سی رہگزر
تیرے بغیر زندگی کب سے ہے شامِ بے سحر

میں نے کہا بہ چشمِ نم، اس نے سنا بہ چشمِ تر
لاکھ فسانہ ہائے شوق، اِک وہ نگاہِ مختصر

میرا سفر ہی در وطن، میرا وطن ہے در سفر
عشق نے توڑ دی کماں، عقل نے ڈال دی سپر

لاکھ ستارے ہر طرف، ظلمتِ شب جہاں جہاں
ایک طلوعِ آفتاب، دشت و چمن سحر سحر

محبت میں جگر گزرے ہیں ایسے بھی مقام اکثر
کہ خود لینا پڑا ہے اپنے دل سے انتقام اکثر

کہاں حُسنِ تمامِ یار و تکلیفِ کرم کوشی
بدل دیتی ہے دُنیا اِک نگاہِ ناتمام اکثر

مری رِندی بھی کیا رندی، مری مستی بھی کیا مستی
مری توبہ بھی بن جاتی ہے میخانہ بہ جام اکثر

محبت نے اسے آغوش میں بھی پالیا آخر
تصوّر ہی میں رہتا تھا جو اِک محشر خرام اکثر

جگر ایسا بھی دیکھا ہے کہ ہنگامِ سیہ مستی
نظر سے چھپ گئے ہیں ساقی و مینا و جام اکثر

کیوں کر رہے، نہ حُسنِ حقیقت نگر سے دُور

انساں، کہ آج تک ہے خود اپنی نظر سے دُور

دیکھے تو کوئی عشق کی یہ سادہ لوحیاں

ہنگامہ چاہتا ہے تری رہ گزر سے دُور

گمراہیوں میں مجھ کو ملی ہیں وہ لذّتیں

بچ بچ کے چل رہا ہوں ہر اک رہ گزر سے دُور

جب تک نگاہ و فکر نہ ہو تیری معتبر

تو مجھ سے مل، مگر مری شام و سحر سے دُور

تری رحمت خطا بخش و خطا پوش
مری جرأت خطا کار و خطا کوش

ہوا جاتا ہے دل پیماں فراموش
کہاں ہے اے جنونِ خانہ بر دوش

یہ کہہ کر ہو گیا دیوانہ خاموش
سلامِ آخری اے جنّتِ ہوش

خبر لے اپنی اے غارت گرِ ہوش
ہوا جاتا ہے تو بھی خود فراموش

نہ پہنچی آنچ دامن تک کسی کے
بڑا احساں ترا اے سوزِ خاموش

بہ اعجازِ نگاہِ نازِ ساقی
مری ہستی ہمہ مستی ہمہ ہوش

اسی کو بڑھ کے ہونا ہے قیامت
سلامت باکرامت فتنۂ ہوش

ہمیں شکوے تھے کیا کیا ان سے لیکن
ہمیں ثابت ہوئے احساں فراموش

## (مسلسل)

وہ احساسِ شوقِ جواں اوّل اوّل
وہ اک عالمِ گل فشاں اوّل اوّل

وہ خود ساختہ اک طلسمِ تمنّا
وہ تالیف و تصنیفِ جاں اوّل اوّل

وہ موہوم سا اک جہانِ محبّت
وہ مبہم سی اک داستاں اوّل اوّل

تخیّل میں رنگینیاں رفتہ رفتہ
تصوّر میں تصویرِ جاں اوّل اوّل

وہ اک کلفتِ شادماں تازہ تازہ
وہ اک عشرتِ سرگراں اوّل اوّل

---

مجسّم و تعبیرِ خوابِ محبّت
وہ نظارۂ ناگہاں اوّل اوّل

وہ اک پیکرِ حسن معصوم و سادہ
وہ اک جلوۂ بے اماں اوّل اوّل

تکلّم میں بے ربط سا اک تسلسل
خموشی میں حسنِ بیاں اوّل اوّل

جگرؔ آہ، انجامِ آغازِ الفت
سکوتِ آخر، فغاں اوّل اوّل

اللہ رے اِس گلشنِ ایجاد کا عالم
جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم

اُف، رنگِ رُخِ بانیٔ بیداد کا عالم
جیسے کسی مظلوم کی فریاد کا عالم

پہروں سے دھڑکنے کی بھی آتی نہیں آواز
کیا جانیے کیا ہے دلِ ناشاد کا عالم

منصور تو سر دے کے سبک ہو گیا لیکن
جلاد سے پوچھے کوئی جلاد کا عالم

میں اور ترے ہجرِ مسلسل کی شکایت !
تیرا ہی تو عالم ہے تری یاد کا عالم

کیا جانیے کیا ہے مری معراجِ مقامی
عالم تو ہے صرف اک مری افتاد کا عالم

ارباب چمن سے نہیں، پوچھو یہ چمن سے
کہتے ہیں کسے نکہتِ برباد کا عالم

کیوں آتشِ گل میرے نشیمن کو جلائے
تنکوں میں ہے خود برقِ چمن زاد کا عالم

حسن کافر شباب کا عالم
سر سے پا تک شراب کا عالم

عرق آلود چہرۂ تاباں
شبنم و آفتاب کا عالم

وہ مری عرضِ شوقِ بے حد پر
کچھ حیا، کچھ عتاب کا عالم

اللہ اللہ، وہ امتزاجِ لطیف
شوخیوں میں حجاب کا عالم

ہمہ نور و سرور کی دنیا
ہمہ حسن و شباب کا عالم

وہ لبِ جوئبار و موسمِ گل
وہ شبِ ماہتاب کا عالم

زانوئے شوق پر وہ پچھلے پہر
نرگسِ نیم خواب کا عالم

دیر تک اختلاطِ راز و نیاز
یک بہ یک اجتناب کا عالم

لاکھ رنگیں بیانیوں پہ مری
ایک سادہ جواب کا عالم

---

غم کی ہر موج، موجِ طوفاں خیز
دل کا عالم حباب کا عالم

دلِ مضطر سمجھ سکے شاید
اک شکستہ رباب کا عالم

وہ سماں آج بھی ہے یاد جگرؔ
ہاں مگر جیسے خواب کا عالم

جنوں کم، جستجو کم، تشنگی کم
نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم

بحمد اللہ، تو ہے جس کا ہمدم
کہاں اس قلب میں گنجائشِ غم

توجّہ بے نہایت اور نظر کم
خوشا یہ التفاتِ حسنِ برہم

مری آنکھوں نے دیکھا ہے وہ عالم
کہ ہر عالم ہے لغزش ہائے پیہم

خطا کیوں کر نہ ہوتی عافیت سوز
کہ جنّت ہی نہ تھی معراجِ آدم

خوشا یہ نسبتِ حسن و محبّت
جہاں بیٹھے نظر آئے ہمیں ہم

وہ اک حسنِ سراپا اللہ اللہ
کہ جس کی ہر ادا عالم ہی عالم

کہاں پہلوئے خورشیدِ جہاں تاب
کہاں اک نازنیں دوشیزہ شبنم

مسرّت زندگی کا دوسرا نام
مسرّت کی تمنّا مستقل غم

رکھتے ہیں خضر سے نہ غرض رہنما سے ہم
چلتے ہیں بچ کے دُور ہر اک نقشِ پا سے ہم

مانوس ہو چلے ہیں جو دل کی صدا سے ہم
شاید کہ جی اُٹھے تری آوازِ پا سے ہم

یارب نگاہِ شوق کو دے اور وسعتیں
گھبرا اُٹھے جمالِ جہت آشنا سے ہم

مخصوص کس کے واسطے ہے رحمتِ تمام
پوچھیں گے ایک دن یہ کسی پارسا سے ہم

او مستِ نازِ حسن تجھے کچھ خبر بھی ہے
تجھ پر نثار ہوتے ہیں کس کس ادا سے ہم

یہ کون چھا گیا ہے دل و دیدہ پر کہ آج
اپنی نظر میں آپ ہیں نا آشنا سے ہم

یہ ذرّے جن کو ہم خاکِ رہِ منزل سمجھتے ہیں
زبانِ حال رکھتے ہیں، زبانِ دل سمجھتے ہیں

جسے سب لوگ حسن و عشق کی منزل سمجھتے ہیں
بلند اس سے بھی ہم اپنا مقامِ دل سمجھتے ہیں

حقیقت میں جو رازِ دوریِ منزل سمجھتے ہیں
انھیں کو ہم سلوکِ عشق میں کامل سمجھتے ہیں

ہمیں کیوں وہ جفائے خاص کے قابل سمجھتے ہیں
یہ رازِ دل ہے اس کو محرمانِ دل سمجھتے ہیں

اسی اک جرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے
کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں

نگاہوں میں کچھ ایسے بس گئے ہیں حسن کے جلوے
کوئی محفل ہو لیکن ہم تری محفل سمجھتے ہیں

کوئی مانے نہ مانے اس کو، لیکن یہ حقیقت ہے
ہم اپنی زندگی میں غیب کو شامل سمجھتے ہیں

یہ موجِ ناتواں موجیں خودی کا راز کیا جانیں
قدم لیتے ہیں طوفاں عظمتِ ساحل سمجھتے ہیں

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
جگرؔ ہم بمبئی کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں

یہ تو نہیں کہ عرضِ غم درخورِ اعتنا نہیں
حسن کو لیکن اے جگرؔ فرصتِ ماسوا نہیں

نالۂ جاں فروز یا نغمۂ غم فزا نہیں
اے دلِ فتنہ آفریں، تو ہے اگر تو کیا نہیں

پیشِ نظر ہے حسنِ دوست، حسن کے ماسوا نہیں
عشق میں مبتلا ہوں میں، شرک میں مبتلا نہیں

غیر نے کچھ اگر کہا، رنج کرے تری بلا
تو ہی جو باوفا نہیں کوئی بھی باوفا نہیں

بیٹھے ہیں بزمِ دوست میں گم شدگانِ حسنِ دوست
عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

پینے سے کام ہے ہمیں میکدۂ حیات میں
ظرف جدا جدا سہی اصل جدا جدا نہیں

پھر یہ جدائیاں ہیں کیوں، پھر یہ دہائیاں ہیں کیوں
عشق سے تو الگ نہیں، حسن سے میں جدا نہیں

پھول وہی، چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے
عہدِ بہار میں تھا کیا، دورِ خزاں میں کیا نہیں

اے مرے مقصدِ حیات گوشۂ چشمِ التفات
ایک نگہ تو ہے بہت، نیم نگہ میں کیا نہیں

اف یہ کرشمہ کاریاں، ہائے یہ ربطِ حسن و عشق
مجھ پہ کوئی نظر نہیں، تیری کوئی خطا نہیں

خشک نہ لب نہ آنکھ تر، واہ رے حضرتِ جگرؔ
جیسے کہ دور کا بھی اب عشق سے واسطہ نہیں

مقاماتِ اربابِ جاں اور بھی ہیں
مکاں اور بھی لا مکاں اور بھی ہیں

مکمل نہیں ہے جنونِ تجسّس
مسلسل جہاں در جہاں اور بھی ہیں

یہیں تک نہیں عشق کی سیرگاہیں
مہ و انجم و کہکشاں اور بھی ہیں

محبّت کی منزل ہی شاید نہیں ہے
کہ جب دیکھیے امتحاں اور بھی ہیں

محبّت نہیں صرف مقصودِ انساں
محبّت میں کارِ جہاں اور بھی ہیں

قفس توڑ کر مطمئن ہو نہ بلبل
قفس صورتِ آشیاں اور بھی ہیں

بہت دل کے حالات کہنے کے قابل
ورائے نگاہ و زباں اور بھی ہیں

نہیں منحصر کچھ مے و میکدہ تک
مری تشنہ سامانیاں اور بھی ہیں

خوشا درسِ غیرت، زہے عشقِ تنہا
وہاں میں نہیں ہوں، جہاں اور بھی ہیں

صبا خاکِ دل سے بچا اپنا دامن
ابھی اس میں چنگاریاں اور بھی ہیں

انھیں جب سے ہے اعتمادِ محبّت
وہ مجھ سے جگرؔ بدگماں اور بھی ہیں

دل میں کسی کے راہ کیے جا رہا ہوں میں
کتنا حسیں گناہ کیے جا رہا ہوں میں

دنیائے دل تباہ کیے جا رہا ہوں میں
صرفِ نگاہ و آہ کیے جا رہا ہوں میں

فردِ عمل سیاہ کیے جا رہا ہوں میں
رحمت کو بے پناہ کیے جا رہا ہوں میں

ایسی بھی اِک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں
ذرّوں کو مہر و ماہ کیے جا رہا ہوں میں

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند
خود حسن کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

دفتر ہے ایک معنیِ بے لفظ و صوت کا
سادہ سی جو نگاہ کیے جا رہا ہوں میں

آگے قدم بڑھائیں جنھیں سوجھتا نہیں
روشن چراغِ راہ کیے جا رہا ہوں میں

معصومیِ جمال کو بھی جن پہ رشک ہے
ایسے بھی کچھ گناہ کیے جا رہا ہوں میں

تنقیدِ حسن مصلحتِ خاصِ عشق ہے
یہ جُرم گاہ گاہ کیے جا رہا ہوں میں

اٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر اس کے روبرو
نادیدہ اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

مجھ سے ادا ہوا ہے جگرؔ جستجو کا حق
ہر ذرّے کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

بے کیف دل ہے اور جیے جا رہا ہوں میں
خالی ہے شیشہ اور پیے جا رہا ہوں میں

پیہم جو آہ آہ کیے جا رہا ہوں میں
دولت ہے غم، زکوٰۃ دیے جا رہا ہوں میں

مجبوریِ کمالِ محبّت تو دیکھنا
جینا نہیں قبول، جیے جا رہا ہوں میں

وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجیے
مجبوریاں ہیں ساتھ دیے جا رہا ہوں میں

رخصت ہوئی شباب کے ہمراہ زندگی
کہنے کی بات ہے کہ جیے جا رہا ہوں میں

پہلے شراب زیست تھی، اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے، پیے جا رہا ہوں میں

جو مسرّتوں میں خلش نہیں، جو اذیتوں میں مزا نہیں
ترے حسن کا بھی قصور ہے، مرے عشق ہی کی خطا نہیں

مرے جذبِ عشق پہ رحمتیں، مجھے بے بسی کا گلا نہیں
ترے جبرِ حسن کی خیر ہو، مرے اختیار میں کیا نہیں

مرا ذوق بھی، مرا شوق بھی، ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی، ترا وصل بھی، مرے دردِ دل کی دوا نہیں

جسے میں بھی خود نہ بتا سکا، مرا رازِ دل ہے وہ رازِ دل
جسے غیرِ دوست سمجھ سکے، مرے ساز میں وہ صدا نہیں

مرا نالہ ہوش رُبا ہو کیا، مرا نغمہ رُوح فزا ہو کیوں
کہ چمن میں پھول تو ہیں وہی مگر ان میں بوئے وفا نہیں

یہ طریقِ جہد ہے خوب تر، مگر آہ واعظِ بے خبر
اسے ساز گار ہوا بنا، جسے معصیت بھی روا نہیں

مرے درد میں یہ خلش کہاں، مرے سوز میں یہ تپش کہاں
کسی اور ہی کی پکار ہے، مری زندگی کی صدا نہیں

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی، وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

وہی ربطِ عشق و جمال ہے، ترا اور کچھ جو خیال ہے
یہ سمجھ تجھی میں ہی کچھ کمی، یہ نہ کہہ کہ جنسِ وفا نہیں

وہی میں ہوں اور وہی انجمن، مگر آج ہی مرا حال کیا
یہ گمان ہے کہ حقیقتاً کوئی اور تیرے سوا نہیں

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں، مری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگرؔ ادبِ کثیف کی جا نہیں

اُس رُخ پہ اژدہامِ نظر دیکھتا ہوں میں
کانٹوں کی گود میں گُلِ تر دیکھتا ہوں میں

سعیِ مآلِ فکر و نظر دیکھتا ہوں میں
منزل رواں دواں ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

تاثیرِ التفاتِ نظر دیکھتا ہوں میں
کونین اپنے زیرِ اثر دیکھتا ہوں میں

خود جس میں آرزوئے شکستِ غرور ہے
ایسی بھی آج ایک نظر دیکھتا ہوں میں

رُعبِ جمال و جذبِ محبّت تو دیکھنا
اُٹھتی نہیں نگاہ مگر دیکھتا ہوں میں

تنہا نہیں ہے عشق ہی رُسوائے جستجو
خود حسن کو بھی گرمِ سفر دیکھتا ہوں میں

اللہ رے کمالِ خودی کی یہ وسعتیں
میرا ہی سامنا ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

اے عشق! شاد باش کہ آج ان کو بار بار
مصروفِ احتیاطِ نظر دیکھتا ہوں میں

محوِ خرامِ ناز ہیں صحنِ چمن میں وہ
گُستاخیِ نسیمِ سحر دیکھتا ہوں میں

میرا مقامِ عشق مقامِ فنا نہیں
دُنیائے زندگی ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

شاید انھیں بھی اس کی خبر ہو نہ اے جگرؔ
در پردۂ نظر جو نظر دیکھتا ہوں میں

جُز عشقِ معتبر یہ کسی کو خبر نہیں
ایسا بھی حسن ہے جو بقیدِ نظر نہیں

سنجیدگی ہزار ہو غم سے مفر نہیں
دریا اُسی میں بند ہے جو آنکھ تر نہیں

دنیا کو دیکھ دیدۂ روشن نگاہ سے
فردوسِ زندگی ہی وبالِ نظر نہیں

جو ہر نفس کے ساتھ نہ لائے پیامِ دوست
ہرگز وہ میری شام، وہ میری سحر نہیں

یہ سُرمگیں نگاہ، یہ انکارِ مضمحل
پھر کیا ہے اعترافِ محبت اگر نہیں

وہ کون سا ہے جلوۂ مکرر کہیں جسے
وہ کون سی نظر ہے، جو پہلی نظر نہیں

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

بھوپال اگرچہ خلد بہ دامن ہے اے جگرؔ
دل کیا شگفتہ ہو کہ نسیمِ جگر نہیں

محبت میں یہ کیا مقام آ رہے ہیں
کہ منزل پہ ہیں اور چلے جا رہے ہیں

یہ کہہ کہہ کے ہم دل کو بہلا رہے ہیں
وہ اب چل چکے ہیں، وہ اب آ رہے ہیں

وہ از خود ہی نادم ہوئے جا رہے ہیں
خدا جانے کیا کیا خیال آ رہے ہیں

ہمارے ہی دل سے مزے ان کے پوچھو
وہ دھوکے جو دانستہ ہم کھا رہے ہیں

جفا کرنے والوں کو کیا ہو گیا ہے
وفا کر کے بھی ہم تو شرما رہے ہیں

وہ عالم ہے اب، یار و اغیار کیسے
ہمیں اپنے دشمن ہوئے جا رہے ہیں

مزاجِ گرامی کی ہو خیر یا رب
کئی دن سے اکثر وہ یاد آ رہے ہیں

کہاں کے لالہ و گل، کیا بہارِ توبہ شکن
کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

یہ کس غضب کی محبت نے ڈال دی الجھن
نہ ضبطِ شوق کا یارا، نہ تابِ عرضِ سخن

خلوصِ شوق، نہ جوشِ عمل، نہ دردِ وطن
یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

جمال اس کا چھپائے گی کیا بہارِ چمن
گلوں سے دب نہ سکی جس کی بوئے پیراہن

وطن ہی جب نہیں اپنا تو پھر کہاں کا وطن
چمن اجاڑ رہا ہوں مگر برائے چمن

غضب ہے، قہر ہے انسان کی یہ بوالعجبی
خود اپنا دوست بہت کم، زیادہ تر دشمن

یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا
بہار میرے لیے اور میں تہی دامن

مرا شعورِ محبت ہے کس لیے ہمہ گوش
اگر نہیں مری جانب کسی کا روئے سخن

ابھی ہے دل کو مقامِ سپردگی سے گریز
اِک اور بھی ہے گیسوئے عنبریں میں شکن

بہوش باش کہ وہ انقلاب آ پہنچا
میں سن رہا ہوں دلِ سنگ و خشت کی دھڑکن

خرد، حقیقتِ چالاک و چست و سست خرام
جنوں، صداقتِ بے باک و مصلحت دشمن

حضورِ دوست یہی جرمِ زندگی نکلا
جنابِ شیخ کو تھا زعمِ پاکیِ دامن

جُنوں کی بے سروسامانیوں پہ رنج نہ کر
اگر جنوں ہے سلامت، ہزار ہا دامن

جہانِ حسن کو بھی جس نے کر دیا بیدار
خوشا وہ سینۂ اہلِ فراق کی دھڑکن

ہر ایک لحظہ ہی در پیش کارزارِ حیات
سکوں تلاش نہ کر اے دلِ سکوں دشمن

وہی ہے روحِ محبت، وہی ہے جسمِ وفا
بدلتا رہتا ہے لیکن مذاقِ پیراہن

مقامِ عشق کی نیرنگیاں نہ پوچھ جگر
کمالِ آگہی و سخت آگہی دُشمن

اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبّت عام سہی، عرفانِ محبّت عام نہیں

یہ تو نے کہا کیا اے ناداں، فیاضیِ قدرت، عام نہیں
تو فکر و نظر تو پیدا کر، کیا چیز ہے جو انعام نہیں

یارب یہ مقامِ عشق ہے کیا، گو دیدہ و دل ناکام نہیں
تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے اور آرام نہیں

کیوں مستِ شرابِ عیش و طرب تکلیف و توجہ فرمائیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے، آوازِ شکستِ جام نہیں

آنا ہے جو بزمِ جاناں میں، پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش و خرد کے دیوانے، یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

زاہد نے کچھ اس انداز سے پی، ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں
میکش یہی اب تک سمجھے تھے، شائستۂ دورِ جام نہیں

عشق اور گوارا خود کر لے، بے شرط شکستِ فاش اپنی
دل کی بھی کچھ ان کے سازش ہے، تنہا یہ نظر کا کام نہیں

سب اس کو اسیری کہتے ہیں، وہ تو ہے اسیری ہی لیکن
وہ کون سی آزادی ہے یہاں، جو آپ خود اپنا دام نہیں

اب لفظِ بیاں سب ختم ہوئے، اب دیدۂ دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا، اب عشق کا کچھ پیغام نہیں

اللہ کے علم و حکمت کے، محدود اگر اکرام نہیں
ہر سانس کے آنے جانے میں کیا کوئی نیا پیغام نہیں

ہر خلدِ تمنا پیشِ نظر، ہر جنّتِ نظّارہ حاصل
پھر بھی ہے وہ کیا شے سینے میں ممکن ہی جسے آرام نہیں

یہ حسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کس کو ہے خبر اس کی لیکن
بے جام ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں

زاہد ترے ان سجدوں کے عوض، سب کچھ ہو مبارک تجھ کو مگر
وہ سجدہ یہاں ہے کفرِ جبیں، جو سجدہ کہ خود انعام نہیں

دُنیا یہ دکھی ہے پھر بھی مگر، تھک کر ہی سہی، سو جاتی ہے
تیرے ہی مقدّر میں اے دل، کیوں چین نہیں، آرام نہیں

اک شاہدِ معنی و صورت کے ملنے کی تمنّا سب کو ہے
ہم اس کے نہ ملنے پر ہیں فدا، لیکن یہ مذاقِ عام نہیں

پینے کو تو سب پیتے ہیں جگر میخانۂ فطرت میں لیکن
محرومِ نگاہِ ساقی ہے، وہ رند جو دُرد آشام نہیں

جب تک انساں پاک طینت ہی نہیں
علم و حکمت، علم و حکمت ہی نہیں

وہ محبت، وہ عداوت ہی نہیں
زندگی میں اب صداقت ہی نہیں

سینۂ آہن بھی تھا جس سے گداز
اب دلوں میں وہ حرارت ہی نہیں

آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر
ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

بھینچ کے رہ جائے وہ غنچہ ہی کہاں!
گھٹ کے رہ جائے وہ نکہت ہی نہیں

حسن کو سمجھا ہے کیا اے بوالہوس!
حسنِ معنیٰ ابھی ہے صورت ہی نہیں

صرف نقالی ہے مغرب کی جگر
شعر میں جب مشرقیت ہی نہیں

بے ربطِ حسن و عشق یہ کیف و اثر کہاں
تھی زندگی عزیز، مگر اس قدر کہاں

تیرے بغیر رونقِ دیوار و در کہاں
شام و سحر کا نام ہے، شام و سحر کہاں

کیا جانیے خیال کہاں ہے نظر کہاں
تیری خبر کے بعد پھر اپنی خبر کہاں

ہر جلوۂ جمال ہے برقِ گریز پا
اے دل یہاں تجلّیِ بارِ دگر کہاں

مانا کہ محتسب بھی بڑا باشعور ہے
لیکن اسے نزاکتِ غم کی خبر کہاں

مل کر ہجومِ جلوہ میں خود جلوہ بن گئی
پہنچا ہے کس جگہ سے مقامِ نظر کہاں

آج اس کی میہماں ہے کل اس کی میہماں
اس خانماں خراب محبت کا گھر کہاں

کہنے کو اہلِ علم کی کوئی کمی نہیں
لیکن خود اپنی فکر، خود اپنی نظر کہاں

ترکِ تعلّقات کو مدّت گزر چکی
ظالم ترے خیال سے پھر بھی مفر کہاں

ہر اعتبارِ دوست پہ صدقے ہزار جاں
لیکن وہ کیفِ وعدۂ نامعتبر کہاں

عرصہ ہوا کہ رسمِ محبت بدل گئی
دامن سے وہ معاملۂ چشمِ تر کہاں

ہر گام پر ہے منزلِ نو جستجو طلب
جاتا ہے سر اٹھائے ہوئے بے خبر کہاں

صد عشرتِ نگاہِ مسلسل خوشا نصیب
لیکن لطافتِ نگہِ مختصر کہاں

ہر چند کائناتِ دو عالم ہیں اے جگر
انساں ہی ایک چیز ہے، انساں مگر کہاں

عشق کی بربادیوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں
بستیاں نکلیں جنھیں ویرانیاں سمجھا تھا میں

بے حجابی کو حجابِ درمیاں سمجھا تھا میں
سامنے کی بات تھی، لیکن کہاں سمجھا تھا میں

ہر نگہ کو طبعِ نازک پر گراں سمجھا تھا میں
وہ بھی کیا دن تھے جب اس کو بدگماں سمجھا تھا میں

شاد باش و زندہ باش، اے عشق خوش سودائے من
تجھ سے پہلے اپنی عظمت بھی کہاں سمجھا تھا میں

کیا خبر تھی خود وہ نکلیں گے برابر کے شریک
دل کی ہر دھڑکن کو اپنی داستاں سمجھا تھا میں

یاد آیا ہے کہ جب ذوقِ طلب کامل نہ تھا
ہر غبارِ کارواں کو کارواں سمجھا تھا میں

آدمی کو آدمی سے بُعد وہ بھی کس قدر
زندگی کو زندگی کا رازداں سمجھا تھا میں

کیا بتاؤں کس قدر زنجیرِ پا ثابت ہوئے
چند تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

زندگی نکلی مسلسل امتحان در امتحاں
زندگی کو داستاں ہی داستاں سمجھا تھا میں

اس گھڑی کی شرم رکھ لے اے نگاہِ نازِ دوست
ہر نفس کو جب حیاتِ جاوداں سمجھا تھا میں

میری ہی رودادِ ہستی تھی مرے ہی سامنے
آج تک جس کو حدیثِ دیگراں سمجھا تھا میں

پردہ اُٹھا تو وہی صورت نظر آئی جگر
مدتوں روح القدس کو ہم زباں سمجھا تھا میں

سب ہی اندازِ حسن پیارے ہیں
ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

اس کی راتوں کا انتقام نہ پوچھ
جس نے ہنس ہنس کے دن گزارے ہیں

اے سہاروں کی زندگی والو!
کتنے انسان بے سہارے ہیں

لالۂ گل سے تجھ کو کیا نسبت
نامکمل سے استعارے ہیں

ہم تو اب ڈوب کر ہی ابھریں گے
وہ رہیں شاد جو کنارے ہیں

شبِ فرقت بھی جگمگا اٹھی
اشکِ غم ہیں کہ ماہ پارے ہیں

آتشِ عشق وہ جہنّم ہے
جس میں فردوس کے نظارے ہیں

وہ ہمیں ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے
گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

حسن کی بے نیازیوں پہ نہ جا
بے اشارے بھی کچھ اشارے ہیں

یہ صحن و روش، یہ لالہ و گل، ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں

منڈلائے ہوئے جب ہر جانب طوفاں ہی طوفاں ہوتے ہیں
دیوانے کچھ آگے بڑھتے ہیں اور دست و گریباں ہوتے ہیں

اس جہد و طلب کی دُنیا میں کیا کار نمایاں ہوتے ہیں
ہم صرف شکایت کرتے ہیں، وہ صرف پشیماں ہوتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں، سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

رندوں نے جو چھیڑا زاہد کو، ساقی نے کہا کس طنز سے آج
اوروں کی وہ عظمت کیا جانیں کم ظرف جو انساں ہوتے ہیں

تو خوش ہے کہ تجھ کو حاصل ہیں، میں خوش کہ مرے حصے میں نہیں
وہ کام جو آساں ہوتے ہیں، وہ جلوے جو ارزاں ہوتے ہیں

آسودۂ ساحل تو ہے مگر، شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اُٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

یہ خون جو ہے مظلوموں کا، ضایع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگرؔ
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

غم معتبر نہیں ہے، مکمّل خوشی نہیں
کیا دقت ہے کہ لطف محبّت میں بھی نہیں

یہ تو نہیں کہ مجھ کو سرِ مے کشی نہیں
لیکن ابھی نہیں مرے ساقی، ابھی نہیں

تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے مگر
دل میں اگر نہیں تو کہیں روشنی نہیں

واعظ اب اور کیا کہوں، لیکن خطا معاف
جو تیرے سامنے ہے حقیقت وہی نہیں

کیا جانیے یہ کون سا عالم ہے اے جگر
دل مضطرب ہے اور کوئی بات بھی نہیں

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن
لاکھ بلائیں ایک نشیمن

کامل رہبر، قاتل رہزن
دل سا دوست، نہ دل سا دشمن

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

عشق ہے پیارے، کھیل نہیں ہے
عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

خیر مزاجِ حسن کی یارب
تیز بہت ہے دل کی دھڑکن

آہ کہ نہ جانے تجھ بِن کب سے
روح ہے لاشہ، جسم ہے مدفن

آج نہ جانے راز یہ کیا ہے
ہجر کی رات اور اتنی روشن

عمریں بیتیں، صدیاں گزریں
ہے وہی اب تک عقل کا بچپن

تجھ سا حسیں اور خونِ محبّت
وہم ہے شاید سرخیِ دامن

برقِ حوادث، اللہ اللہ!
جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن

تو نے سلجھ کر گیسوئے جاناں
اور بڑھا دی شوق کی الجھن

رحمت ہوگی طالبِ عصیاں
رشک کرے گی پاکیِ دامن

دل، کہ مجسّم آئینہ ساماں
اور وہ ظالم آئینہ دشمن

بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن
جھاڑ کے اُٹّھے اپنا دامن

ق

ہستی شاعرؔ، اللہ، اللہ!
حسن کی منزل، عشق کا مدفن
رنگیں فطرت، سادہ طبیعت
فرش نشیں اور عرش نشیمن

ق

کام ادھورا، اور آزادی
نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے، لیکن دھندلی دھندلی
سایہ ہے، لیکن روشن روشن

---

کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر
کون چھڑائے اپنا دامن
چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے
کس کا صحرا، کیسا گلشن

ہم کو مٹا سکے، یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے؛ زمانے سے ہم نہیں

بے فائدہ الم نہیں، بے کار غم نہیں
توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

میری زباں پہ شکوۂ اہلِ ستم نہیں
مجھ کو جگا دیا یہی احسان کم نہیں

یارب ہجومِ درد کو دے اور وسعتیں
دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں

شکوہ تو ایک چھیڑ ہے، لیکن حقیقتاً
تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں

اب عشق اس مقام پہ ہے جستجو نورد
سایہ نہیں جہاں؛ کوئی نقشِ قدم نہیں

ملتا ہے کیوں مزا ستمِ روزگار میں
تیرا کرم بھی خود جو شریکِ ستم نہیں

زاہد کچھ اور ہو نہ ہو مے خانے میں مگر
کیا کم یہ ہے کہ فتنۂ دیر و حرم نہیں

مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز
اک سانحہ سہی، مگر اتنا اہم نہیں

عشق لامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

بیکراں ہوتا نہیں، بے انتہا ہوتا نہیں
قطرہ جب تک بڑھ کے قلزم آشنا ہوتا نہیں

اس سے بڑھ کر دوست کوئی دوسرا ہوتا نہیں
سب جدا ہو جائیں لیکن غم جدا ہوتا نہیں

زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ !
موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں

کون یہ ناصح کو سمجھائے بطرزِ دل نشیں
عشق صادق ہو تو غم بھی بے مزا ہوتا نہیں

درد سے معمور ہوتی جا رہی ہے کائنات
اک دلِ انساں مگر درد آشنا ہوتا نہیں

میری عرضِ غم پہ وہ کہنا کسی کا ہائے ہائے
شکوۂ غم شیوۂ اہلِ وفا ہوتا نہیں

اس مقامِ قرب تک اب عشق پہنچا ہی جہاں
دیدہ و دل کا بھی اکثر واسطہ ہوتا نہیں

ہر قدم کے ساتھ منزل لیکن اس کا کیا علاج
عشق ہی کم بخت منزل آشنا ہوتا نہیں

اللہ اللہ یہ کمالِ ارتباطِ حسن و عشق
فاصلے ہوں لاکھ دل سے دل جدا ہوتا نہیں

وقت آتا ہے اک ایسا بھی سرِ بزمِ جمال
سامنے ہوتے ہیں وہ اور سامنا ہوتا نہیں

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

جو طوفانوں میں پلتے جا رہے ہیں
وہی دنیا بدلتے جا رہے ہیں

نکھرتا آ رہا ہے رنگِ گلشن
خس و خاشاک جلتے جا رہے ہیں

وہیں میں خاک اُڑتی دیکھتا ہوں
جہاں چشمے اُبلتے جا رہے ہیں

چراغِ دیر و کعبہ، اللہ اللہ!
ہوا کی زد پہ جلتے جا رہے ہیں

شبابِ حسن میں بحث آ پڑی ہے
نئے پہلو نکلتے جا رہے ہیں

○
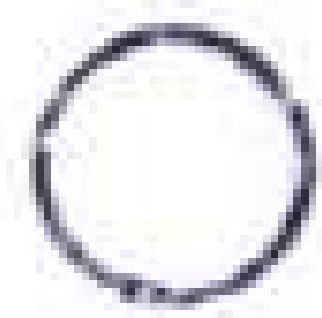
شیطاں نہیں، فرشتہ نہیں، یا خدا نہیں
انساں ہو مشتِ خاک مگر اس میں کیا نہیں

جز مدعائے دوست کوئی مدعا نہیں
یعنی مزاجِ عشق غرض آشنا نہیں

یاں ہر نگہ سوال، وہاں ہر ادا جواب
اپنا معاملہ تو کچھ اس کے سوا نہیں

اب کوئی تیر دل کے پار نہیں
اب مجھے زندگی سے پیار نہیں

اب کوئی روح کی پکار نہیں
اب کسی کا بھی انتظار نہیں

اب کوئی غم نہیں طرب افزا
اب کوئی دردِ خوشگوار نہیں

زخم سینے پہ آج بھی ہے مگر
ناخنِ عشق تازہ کار نہیں

حسن رہتا نہ اس قدر دلکش
خیر گزری کہ پائیدار نہیں

ہیں تو دیوانۂ بہار بہت
کوئی شائستۂ بہار نہیں

انساں ہے زندگی سے نالاں　　انساں سے زندگی پشیماں

اے جلوۂ دوست تیرے قرباں　　دل سے ہے نگاہ تک چراغاں

ہم سے تو نہ ہو سکی حفاظت　　اے دل ترا اب خدا نگہباں

انساں کہاں کہ مدتوں سے　　انساں کی تلاش میں ہے انساں

تکلیفِ ستم ستم نہ بن جائے
اے ناز کشِ نیاز منداں

غم میں بھی جس کو اک سرور نہیں — زندگی کا اسے شعور نہیں

دل ہی وہ کیا جو ناصبور نہیں — تو نہ شرما، ترا قصور نہیں

عشق ہی کیا کہ جو نہ ہو بیباک — حسن ہی کیا، جسے غرور نہیں

نشۂ آرزو، معاذاللہ! — کون اس میکدے میں چور نہیں

مجھ کو شکوہ ہے چشمِ ساقی سے (ق) — جی رہا ہوں مگر سرور نہیں

لالہ و گل بھی اُجڑے اُجڑے سے — شبِ مہتاب میں بھی نور نہیں

یہ ہے قربت تو اس کو کیا کہیے — ہم ہیں جیسے ترے حضور نہیں

زندگی ہے ترے فراق کا نام — اور تو زندگی سے دُور نہیں

کل دکھائے گا کیا بہار کو مُنہ — دل جو زخموں سے آج چور نہیں

میں ہوں اور دشتِ غم کا سنّاٹا — کوئی آواز دُور دُور نہیں

دل عبارت ہے سوزِ پیہم سے — دل کی معراج برقِ طور نہیں

اپنی جنت کی فکر کر واعظ

میری جنّت تو مجھ سے دُور نہیں

یوں وہ بیگانہ وار ملتے ہیں  جیسے اب تک انھیں خبر ہی نہیں

دل کی باتوں کو مختصر نہ سمجھ  دل کی ہر بات مختصر ہی نہیں

کیوں غمِ عشق کو نہ دیں وسعت  جب غمِ عشق سے مفر ہی نہیں

زندگی کی ہے ایک منزل بھی  زندگی صرف اک سفر ہی نہیں

ان دلوں روزگارِ عشق نہ پوچھ  شام بھی ہے خفا سحر ہی نہیں

دل کو کیا ہو گیا، خدا جانے  کیا گزرتی ہے کچھ خبر ہی نہیں

ہائے وہ اک نگاہِ خاص جگرؔ
جو بہت کچھ ہے مختصر ہی نہیں

جب تک کہ غمِ انساں سے جگرؔ، انسان کا دل معمور نہیں
جنت ہی سہی دُنیا لیکن، جنت سے جہنم دُور نہیں

جُز ذوقِ طلب، جُز شوقِ سفر، کچھ اور ہمیں منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا، کہتے ہیں کہ منزل دُور نہیں

واعظ کا ہر اِک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

میں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں، قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی وہ وار کہ جو بھرپور نہیں

اس نفع و ضرر کی دُنیا سے، میں نے یہ لیا ہے درسِ جنوں
خود اپنا زیاں تسلیم مگر، اوروں کا زیاں منظور نہیں

اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی ہی گذارش ہے میری
دُنیا سے قیامت دُور سہی، دُنیا کی قیامت دُور نہیں

عمر بھر روح کی اور جسم کی یکجائی ہو
کیا قیامت ہے کہ پھر بھی نہ شناسائی ہو

کوئی اتنا بھی نہ مصروفِ خود آرائی ہو
کہ تماشا رہے باقی نہ تماشائی ہو

انجمن ہو نہ سرِ انجمن آرائی ہو
میں ہوں اور صرف مرا عالمِ تنہائی ہو

مستیِ حسن غمِ عشق پہ یوں چھائی ہو
دل سے جو موجِ غم اٹھے، تری انگڑائی ہو

اے غمِ دوست ترا صبر مجھی پر ٹوٹے
بے ترے نیند بھی آنکھوں میں اگر آئی ہو

وہ محبت ہی نہیں ہے وہ قیامت ہی نہیں
جو ترے پائے نگاریں کی نہ ٹھکرائی ہو

ہوگئی دل کو تری یاد سے اک نسبتِ خاص
اب تو شاید ہی میسّر کبھی تنہائی ہو

داغِ دل کیوں کوئی مجروحِ پذیرائی ہو
گلِ ویرانہ بنے، لالۂ صحرائی ہو

دل اُلٹ جائے کہ دم پر مرے بن آئی ہو
کیوں تری یاد شریکِ غمِ تنہائی ہو

پھر وہی رُت، وہی ہم تم، وہی تنہائی ہو
پھر ہر اِک چوٹ محبت کی اُبھر آئی ہو

نالہ یوں کیجے، یہ اعجازِ شکیبائی ہو
جیسے بے ساختہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہو

حسن وہ بے چارگیِ حسن! الٰہی توبہ
میں تو مر جاؤں جو یوں عشق کی بن آئی ہو

عرصۂ حشر کہاں، جلوہ گہِ دوست کہاں
وہ بھی میرا ہی نہ اِک گوشۂ تنہائی ہو

بھول جاؤں کہ مرا فرضِ محبت کیا ہے
اس طرح تو نہ مری حوصلہ افزائی ہو

گر کے نظروں سے تری اس کا ٹھکانا ہی کہاں
جس نے ظالم ترے دل میں بھی جگہ پائی ہو

ہائے اس حصۂ گلشن کا مقدر ہمدم
نہ خزاں آئی ہو جس میں نہ بہار آئی ہو

یوں بھی ہو کاش غمِ عشق کی تاثیرِ جگر
میں تمنا نہ کروں اور وہ تمنائی ہو

ممکن نہیں کہ جذبۂ دل کارگر نہ ہو
یہ اور بات ہے، تمھیں اب تک خبر نہ ہو

توہینِ عشق، دیکھ نہ ہو، اے جگر نہ ہو
ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

دریائے حسن و کارِ غمِ عشق ناصحا
یہ کیا کہا "ترا سرِ دامن بھی تر نہ ہو"

لازم خودی کا ہوش بھی ہے بےخودی کے ساتھ
کس کی اسے خبر، جسے اپنی خبر نہ ہو

وہ بدگمانیاں ہیں نہ وہ سرگرانیاں
اتنی بھی دل کی دل کو الٰہی خبر نہ ہو

احسانِ عشق اصل میں توہینِ حسن ہے
حاضر ہیں دین و دل بھی ضرورت اگر نہ ہو

یا طالبِ دعا تھا میں اک ایک سے جگر
یا خود یہ چاہتا ہوں دعا میں اثر نہ ہو

پھول بسر کرتے ہیں خاروں کے ساتھ
کھیلتے ہیں ہم بھی شراروں کے ساتھ

کم نہ ہوئیں ان سے بھی کچھ ظلمتیں
ربط بڑھایا تھا ستاروں کے ساتھ

عشق کہیں تجھ سے نہ لے انتقام
چھیڑ نہ کر عشق کے ماروں کے ساتھ

ایک نظر، ایک دلِ ناتواں
معرکہ درپیش ہزاروں کے ساتھ

عشق میں کیا ہے یہی معراجِ دید
گم ہیں نگاہیں بھی نظاروں کے ساتھ

رقص میں ہے کب سے دلِ کائنات
دیدہ و نادیدہ اشاروں کے ساتھ

لوٹ بہار، بس نہ چمن کی بہت
تو بھی نہ لُٹ جائے بہاروں کے ساتھ

صبح ہے دُور اور ابھی سے جگر
ڈوب چلی نبض ستاروں کے ساتھ

جان فدا اس پہ کہ جس نے جگر
زیست بسر کی نہ سہاروں کے ساتھ

ابھی نہ روک نگاہوں کو پیرِ میخانہ
کہ زندگی ہے ابھی زندگی سے بیگانہ

فضائے کعبہ ہو یا سرزمینِ بُت خانہ
ترے سوا نہ حقیقت، نہ کوئی افسانہ

سحر ہوئی، وہ بڑھے ہاتھ سوئے پیمانہ
پیامِ شاہدِ نوخیز و پیرِ میخانہ

حدیثِ حسن نہ شغلِ شراب و پیمانہ
یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا افسانہ

مذاقِ عشق کی تفریق، اے معاذ اللہ!
بہم ہوئے نہ کبھی عندلیب و پروانہ

ستم بھی ڈھائے کسی نے تو اس توجّہ سے
کہ بن گیا دلِ صد پارہ آئینہ خانہ

جنونِ عشق کی کافرادائیاں توبہ!
نگاہِ زہد بھی پڑنے لگی حریصانہ

وہیں وہیں سے اُٹھے ہیں ہزارہا فتنے
جہاں جہاں سے میں گزرا ہوں بے نیازانہ

خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع، جلنے دو
پرائی آگ میں جلنا ہے کارِ مردانہ

وہ ایک شعرِ مجسّم، وہ ایک پیکرِ حسن
وہ سیرِ باغ بہ اندازِ بے نیازانہ

نظر نظر متبسّم، اگرچہ بے پروا
نفس نفس متوجّہ، اگرچہ بیگانہ

فدائے نیم نقابی تمام نکہت و رنگ
نثارِ نیم نگاہی تمام میخانہ

## (مسلسل)

سراپا حقیقت، مجسّم فسانہ — محبّت کا عالم، جنوں کا زمانہ

ہمہ شعر و نغمہ، ہمہ رنگ و نکہت — وہ جانِ تمنّا، وہ حسنِ یگانہ

وہ پہلے پہل دونوں جانب یہ عالم — ادائے تعلّق، نظر مجرمانہ

نظر ملتے جھکتے، نظر ملتے ملتے — دھڑکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ

حیا میں وہ معصوم سی اک شرارت — شرارت میں موہوم سا اک فسانہ

وہ ہر چھیڑ میں اک نئی زندگانی — وہ ہر بات میں اک نیا شاخسانہ

طبیعت شگفتہ، مگر کھوئی کھوئی — ہر انداز دلکش، مگر والہانہ

وہ اخفائے رازِ محبّت کی خاطر — کبھی کچھ بہانہ، کبھی کچھ بہانہ

وہ اشک و تبسّم کا پُر کیف موسم — وہ شعر و ترنّم کا رنگیں زمانہ

کبھی روئے زیبا پہ غصّے کی لہریں — کہ جیسے کوئی بجلیوں کا خزانہ

وہ با ربط سا اک طلسمِ معانی — وہ بے ربط سا اک مسلسل فسانہ

جنونِ مکمّل کا بھی ایک عالم — سکوتِ مسلسل کا بھی اک زمانہ

غرورِ تحمّل مگر زخم خوردہ
شکستِ محبّت، مگر فاتحانہ

یہ فلک، یہ ماہ و انجم، یہ زمین، یہ زمانہ
ترے حسن کی حکایت، مرے عشق کا فسانہ

یہ ہے عشق کی کرامت، یہ کمالِ شاعرانہ
ابھی منہ سے بات نکلی، ابھی ہو گئی فسانہ

یہ علیل سی[1] فضائیں، یہ مریض سا زمانہ
تری پاک تر جوانی، ترا حسن معجزانہ

یہ مرا پیام کہنا تو صبا مؤدبانہ
کہ گزر گیا ہے پیارے تجھے دیکھے اک زمانہ

مجھے چاکِ جیب و دامن سے نہیں مناسبت کچھ
یہ جنوں ہی کو مبارک رہ و رسمِ عامیانہ

تجھے حادثاتِ پیہم سے بھی کیا ملے گا ناداں
ترا دل اگر ہو زندہ تو نفس بھی تازیانہ

تری اک نمود سے ہے ترے اک حجاب تک ہی
مری فکرِ عرش پیما، مرا نازِ شاعرانہ

مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا ہے
مرے دل سے کہہ گئی کیا وہ نگاہِ ناقدانہ

تجھے اے جگر ہوا کیا کہ بہت دنوں سے پیارے
نہ بیانِ عشق و مستی، نہ حدیثِ دلبرانہ

---

[1] "آرٹ" کا حسن سمجھیے یا جو کچھ، صرف اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ جگر

وہ ادائے دلبری ہو، کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتحِ زمانہ

یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ

کبھی حسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی نازِ بے نیازی، وہی شانِ خسروانہ

میں ہوں اس مقام پر اب کہ فراق و وصل کیسے
مرا عشق بھی کہانی، ترا حسن بھی فسانہ

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہیے بہانہ

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

تری دوری و حضوری کا ہے یہ عجیب عالم
ابھی زندگی حقیقت، ابھی زندگی فسانہ

مرے ہم صفیرِ بلبل، مرا تیرا ساتھ ہی کیا
میں ضمیرِ دشت و دریا، تو اسیرِ آشیانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم غمِ زمانہ

ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک، یہ شکستِ فاتحانہ

اے شبنمِ آسماں چکیدہ ۔۔۔ کیا سب ہیں وہاں بھی غم رسیدہ

میں گل ہوں مگر خزاں رسیدہ ۔۔۔ بلبل ہوں مگر چمن گزیدہ

اِک شاعرِ منفرد ہوں یعنی ۔۔۔ اِک جنسِ گراں ہوں ناخریدہ

کب سے ہوں سخن طراز لیکن ۔۔۔ اب تک ہوں نوائے ناشنیدہ

کیا سعیِ طرب کہ جانتا ہوں ۔۔۔ ہر غم ہے مسرّت آفریدہ

کعبے میں سکوں نہ میکدے میں ۔۔۔ لے جاؤں کہاں دلِ تپیدہ

بیتاب ہے روحِ عشق جب سے ۔۔۔ دیکھا ہے کسی کو آب دیدہ

اللہ رے قرارِ بے قراری ۔۔۔ رنگِ رُخِ حسن تک پریدہ

ہر شے ہے تمام ناتمامی ۔۔۔ ایک میں ہی نہیں فراق دیدہ

ہوتا ہے نہ جانے کیوں یہ محسوس ۔۔۔ فطرت بھی ہے جیسے غم رسیدہ

شاداب چمن چمن اسی سے ۔۔۔ شبنم کہ تمام آبدیدہ

اِک شور ہے نغمگی کا لیکن ۔۔۔ نغمہ ہے ہنوز ناشنیدہ

رِندوں کو بہت نہ چھیڑ واعظ ان میں بھی ہیں کچھ خدا رسیدہ

اے شاہدِ حسن تیرے آگے ہر نقشِ جمال خط کشیدہ

اے جانِ بہار تیری خاطر ہر پھول ہے پیرہن دریدہ

میرا ہے جگرؔ یہ قولِ فیصل (ق) کچھ لوگ اگرچہ ہوں کبیدہ

فضلیؔ[1] سے ہے آبروِ غزل کی
ہر صنفِ سخن میں برگزیدہ

---

[1] جناب فضل احمد کریم صاحب فضلیؔ الہ آبادی ثم پاکستانی

بے غمِ عشق و بے دلِ آگاہ
موت بھی جرم، زندگی بھی گناہ

میں چلا جا رہا تھا اپنی راہ
سامنے آپ آ گئے ناگاہ

کس کا شکوہ کہاں کا حالِ تباہ
اُف! وہ نازک سی زیرِ لب اک آہ

جو تری بزم تیری جولاں گاہ
دل وہی دل، وہی نگاہ، نگاہ

سایۂ زلفِ یار، کیا کہنا!
زندگی کو نہ تھی کہیں بھی پناہ

کیا غضب ہے کہ اک زمانے سے
آدمی کو ترس رہی ہے نگاہ

عشق ہی اس کو جانتا ہے کہ ہے
اک نگہ اور بھی ورائے نگاہ

میکدے میں کہاں جنابِ شیخ
آ ہی نکلے تو خیر، بسم اللہ

آپ پھولوں سے جھولیاں بھر لیں
ہم نے کانٹوں سے کر لیا ہے نباہ

اب غمِ دو جہاں بھی راحت ہے
اے غمِ عاشقی! جزاک اللہ

میں بہر حال ہوں فراق نصیب
تو بہر رنگ ہے مرے ہمراہ

محبّت کارفرمائے دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ ہر دُنیائے دل شائستۂ غم ہوتی جاتی ہے
ہر اک صورت، ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی! کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے
زمانہ گرمِ رفتارِ ترقّی ہوتا جاتا ہے
مگر اک چشمِ شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے
جہاں تک توڑتا جاتا ہوں رسمِ ظاہر و باطن
دلیلِ عاشقی اتنی ہی محکم ہوتی جاتی ہے
جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور برہم، اور برہم ہوتی جاتی ہے
نزاکت ہائے احساسِ محبّت، اے معاذاللہ!
کہ اب اِک اک گھڑی اک ایک عالم ہوتی جاتی ہے

غرورِ حسن رخصت، الفراق اے نازِ خود بینی

مزاجِ حسن سے اب تمکنت کم ہوتی جاتی ہے

یہی جی چاہتا ہے چھیڑتے ہی چھیڑتے رہیے

بہت دل کش ادائے حسن برہم ہوتی جاتی ہے

ارے توبہ، یہ تشکیلِ شبابِ حسن، ارے توبہ!

کہ ہر ظالم ادا تقدیرِ عالم ہوتی جاتی ہے

تصوّر رفتہ رفتہ اِک سراپا بنتا جاتا ہے

وہ اِک شے جو مجھی میں ہے مجسّم ہوتی جاتی ہے

وہ رہ رہ کر گلے مل مل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں

مری آنکھوں سے یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

جدھر سے میں گزرتا ہوں، نگاہیں اٹھتی جاتی ہیں

مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے

جگرؔ تیرے سکوتِ غم نے یہ کیا کہہ دیا ان سے

جھکی پڑتی ہیں نظریں بس آنکھ پُرنم ہوتی جاتی ہے

طبیعت اِن دنوں بیگانۂ غم ہوتی جاتی ہے
مرے حصّے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

سحر ہونے کو ہے، بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے
خوشی منجملۂ اسبابِ ماتم ہوتی جاتی ہے

قیامت کیا یہ اے حسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ محفل تو وہی ہے، دل کشی کم ہوتی جاتی ہے

وہی میخانۂ و صہبا، وہی ساغر، وہی شیشہ
مگر آوازِ نوشانوش مدّھم ہوتی جاتی ہے

وہی ہیں شاہد و ساقی، مگر دل بجھتا جاتا ہے
وہی ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

وہی شورش ہے لیکن جیسے موجِ تہ نشیں کوئی
وہی دل ہے، مگر آواز مدّھم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے زندگی لیکن جگرؔ یہ حال ہے اپنا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

کیا کشش حسنِ بے پناہ میں ہے　　جو قدم ہے، اسی کی راہ میں ہے

میکدے میں نہ خانقاہ میں ہے　　جو تجلّی دلِ تباہ میں ہے

ہائے وہ رازِ غم کہ جواب تک　　تیرے دل میں مری نگاہ میں ہے

عشق میں کیسی منزلِ مقصود　　وہ بھی اک گرد ہی جو راہ میں ہے

میں جہاں ہوں ترے خیال میں ہوں　　تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے

حسن کو بھی کہاں نصیب جگرؔ
وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بُجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

نگاہوں کو خزاں نا آشنا بننا تو آجائے
چمن جب تک چمن ہے جلوہ سامانی نہیں جاتی

پشیمانِ ستم وہ دل ہی دل میں رہتے ہیں لیکن
خوشا حُسنے کہ طرزِ ناپشیمانی نہیں جاتی

مزاجِ اہلِ دل بے کیف و مستی رہ نہیں سکتا
کہ جیسے نکہتِ گل سے پریشانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوالیتی ہے مانی نہیں جاتی

بلندی چاہیے انسان کی فطرت میں پوشیدہ
کوئی ہو بھیس لیکن شانِ سلطانی نہیں جاتی

گئے وہ دن کہ دل سرمایہ دارِ دردِ پیہم تھا
مگر آنکھوں کی اب تک میر سامانی نہیں جاتی

جسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

مجھے تو کر دیا سیراب ساقی نے مرے لیکن
مرے سیرابیوں کی تشنہ سامانی نہیں جاتی

نہیں معلوم کس عالم میں حسنِ یار دیکھا تھا
کوئی عالم ہو لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

محبّت میں اِک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی ز سرتا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبّت صاف پہچانی نہیں جاتی

تکلّف سے تصنّع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے، وہی ہے زندگی اپنی

نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی
حقیقت میں تھی جیسے مدّتوں سے دوستی اپنی

وہ ان کی بے رُخی، وہ بے نیازانہ ہنسی اپنی
بھری محفل تھی لیکن بات بگڑی بن گئی اپنی

جمال ان کا، مزاج اپنا، غم ان کا، زندگی اپنی
حیاتِ حسن ہے گویا، حیاتِ عاشقی اپنی

یہاں تک تو جگرؔ پہنچی ہے معراجِ خودی اپنی
کہ حسن اک مشغلہ اپنا ہے، عشق اک دل لگی اپنی

ہمیں کیوں اب کوئی سمجھائے، دل اپنا خوشی اپنی
گریباں اپنا، ہاتھ اپنا، جنوں اپنا، ہنسی اپنی

اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی لیکن واقعہ یہ ہے
کہ ترکِ مے کشی پر بھی وہی ہے مے کشی اپنی

جگرؔ وہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

اگر شامل نہ درپردہ کسی کی آرزو ہوتی
تو پھر اے زندگی ظالم نہ میں ہوتا نہ تو ہوتی

اگر حائل نہ اس رخ پر نقابِ رنگ و بو ہوتی
کسے تابِ نظر رہتی، مجالِ آرزو ہوتی

نہ اِترا کر یہ رک جاتی نہ یوں بے آبرو ہوتی
محبت جستجو تھی، جستجو ہی جستجو ہوتی

ترا ملنا تو ممکن تھا مگر اے جانِ مجبوری
مرے نزدیک توہینِ مذاقِ جستجو ہوتی

نگاہِ شوق اسے بھی ڈھال لیتی اپنے سانچے میں
اگر اک اور بھی دنیا ورائے رنگ و بو ہوتی

وہی اس نظر میں ہیں کھب جانے والے
جو سینوں میں ہیں برچھیاں کھانے والے

شکن کاش پڑ جائے اپنی جبیں پر
پریشاں بہت ہیں ستم ڈھانے والے

سراپا محبّت بنے جا رہے ہیں
سلامت رہیں ان کو بہکانے والے

بغور اپنی جانب بھی اے کاش دیکھیں
مرے حال پر رحم فرمانے والے

محبّت کی باتیں، محبّت ہی جانے
معمے نہیں ہیں یہ سمجھانے والے

ترے حسن کا راز کیوں کر چھپاؤں
مرے دیدہ و دل پہ چھا جانے والے

مری طاقتِ ضبط کی خیر یا رب
کرم پر تلے ہیں ستم ڈھانے والے

جو ہیں خاصِ چشم و چراغِ محبّت
وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے

آنکھوں میں بس کے دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی جگا کر چلے گئے

حسنِ ازل کی شان دکھا کر چلے گئے
اِک واقعہ سا یاد دِلا کر چلے گئے

چہرے تک آستین وہ لا کر چلے گئے
کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

رگ رگ میں اس طرح وہ سما کر چلے گئے
جیسے مجھی کو مجھ سے چرا کر چلے گئے

میری حیاتِ عشق کو دے کر جنونِ شوق
مجھ کو تمام ہوش بنا کر چلے گئے

سمجھا کے پستیاں مرے اوجِ کمال کی
اپنی بلندیاں وہ دکھا کر چلے گئے

اپنے فروغِ حسن کی دکھلا کے وسعتیں
میرے حدودِ شوق بڑھا کر چلے گئے

ہر شے کو میری خاطرِ ناشاد کے لیے
آئینۂ جمال بنا کر چلے گئے

آئے تھے دل کی پیاس بجھانے کے واسطے
اِک آگ سی وہ اور لگا کر چلے گئے

آئے تھے چشمِ شوق کی حسرت نکالنے
سر تا قدم نگاہ بنا کر چلے گئے

اب کاروبارِ عشق سے فرصت مجھے کہاں
کونین کا وہ درد بڑھا کر چلے گئے

شکرِ کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول
اپنا سا کیوں نہ مجھ کو بنا کر چلے گئے

لب تھرتھرا کے رہ گئے لیکن وہ اے جگر
جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے

وہ جو روٹھیں یوں منانا چاہیے
زندگی سے روٹھ جانا چاہیے

ہمتِ قاتل بڑھانا چاہیے
زیرِ خنجر مُسکرانا چاہیے

زندگی ہے نامِ جہد و جنگ کا
موت کیا ہے بھول جانا چاہیے

ہے انھیں دھوکوں سے دل کی زندگی
جو حسیں دھوکا ہو کھانا چاہیے

لذّتیں ہیں دشمنِ اوجِ کمال
کُلفتوں سے جی لگانا چاہیے

ان سے ملنے کو تو کیا کہیے جگرؔ
خود سے ملنے کو زمانا چاہیے

برابر سے بچ کر گزر جانے والے
یہ نالے نہیں بے اثر جانے والے

نہیں جانتے کچھ کہ جانا کہاں ہے
چلے جا رہے ہیں مگر جانے والے

مرے دل کی بیتابیاں بھی لیے جا
دبے پاؤں منہ پھیر کر جانے والے

ترے اک اشارے پہ ساکت کھڑے ہیں
"نہیں" کہہ کے سب سے گزر جانے والے

محبت میں ہم تو جیے ہیں، جییں گے
وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

سودا جو ہے سر میں، وہ سودا ہی اور ہے
اس کا چمن ہی اور ہے صحرا ہی اور ہے

لیلائے آب و گل تو ہزاروں ہزار ہیں
مجنوں ہے جس کی روح وہ لیلیٰ ہی اور ہے

جو حسنِ کشش بہت سے نہ سیراب ہو سکی
محسوس اب ہوا وہ تمنّا ہی اور ہے

خود حسن استعارہ ہے جس کے جمال کا
وہ جانِ حسن، حسن سراپا ہی اور ہے

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرتِ بلند
شاید وہ حسن و عشق کی دُنیا ہی اور ہے

صورت میں یہ فروغ، یہ جذب و کشش کہاں
درپردہ کوئی شاہدِ معنیٰ ہی اور ہے

یہ حسنِ رنگ رنگ بھی کچھ کم نہ تھا جگرؔ
کیا کیجیے کہ دل کا تقاضا ہی اور ہے

یوں پرسشِ ملال وہ فرما کے رہ گئے ‌ ‌ ‌ شکوے مری زباں تک آ آ کے رہ گئے

پہلے تو عرضِ غم پہ وہ جھنجھلا کے رہ گئے ‌ ‌ ‌ پھر کچھ سمجھ کے سوچ کے شرما کے رہ گئے

آئینہ چوم چوم رہے تھے وہ بار بار ‌ ‌ ‌ دیکھا جو یک بیک مجھے شرما کے رہ گئے

وہ کون ہے کہ جو سرِ منزل پہنچ سکا ‌ ‌ ‌ دھندلے سے کچھ نشان نظر آ کے رہ گئے

نغموں پہ میرے اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکے ‌ ‌ ‌ کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے

ہر شکر انتقامِ محبت ہے اے جگرؔ
شکوہ نہیں ہے ان سے جو تڑپا کے رہ گئے

پھر دل ہے قصدِ کوچۂ جاناں کیے ہوئے
رگ رگ میں نیشِ عشق کو پنہاں کیے ہوئے

پھر عزلتِ خیال سے گھبرا رہا ہے دل
ہر وسعتِ خیال کو زنداں کیے ہوئے

پھر چشمِ شوق دیر سے لبریزِ شکوہ ہے
قطروں کو موج، موج کو طوفاں کیے ہوئے

پھر جانِ بے قرار ہے آمادۂ فغاں
سو حشر اک سکوت میں پنہاں کیے ہوئے

پھر کیفِ بے خودی میں بڑھا جا رہا ہوں میں
سب کچھ نثارِ شوقِ فراواں کیے ہوئے

پھر سوئے خلدِ حسن کھنچا جا رہا ہے دل
ہر جنتِ نظارہ کو ویراں کیے ہوئے

پھر بڑھ چلا ہے جوشِ طلب راہِ دوست میں
سو فتح ہر شکست پہ قرباں کیے ہوئے

پھر بڑھ چلیں جنونِ تمنا کی شورشیں
برہم نظامِ عالمِ امکاں کیے ہوئے

پھر ہے نگاہِ شوق کو دیدار کی ہوس
مدت ہوئی ہے جرأتِ عصیاں کیے ہوئے

پھر لے چلی ہے وحشتِ دل شہرِ حسن میں
جنسِ گمانِ عشق کو ارزاں کیے ہوئے

پھر جی یہ چاہتا ہے کہ بیٹھے رہیں جگر
ان کی نظر سے بھی انھیں پنہاں کیے ہوئے

آئے ہیں پھر وہ عزمِ دل و جاں کیے ہوئے
پلکوں کی اوٹ حشر کا ساماں کیے ہوئے

پھر اُٹھ رہی ہے عارضِ پُر نور سے نقاب
نظّارہ و نظر کو پریشاں کیے ہوئے

ہر شام و صبح: زلف و رُخِ یار ہیں بہم
ایماں کو کفر، کفر کو ایماں کیے ہوئے

پھر حسنِ منفعل متبسّم ہے زیرِ لب
یک قطرہ اشک زینتِ مژگاں کیے ہوئے

ہم نے دنیا ہی میں دنیائے حقیقت دیکھی
یہیں دوزخ نظر آئی، یہیں جنت دیکھی

عشق کے بھیس میں جب حسن کی صورت دیکھی
ہر ادا پھر تو قیامت ہی قیامت دیکھی

منفرد رنج، نہ تنہا کوئی راحت دیکھی
یہ تری نیم نگاہی کی شرارت دیکھی

جب تجھے دیکھ کے کونین کی وسعت دیکھی
حسن ہی حسن، محبت ہی محبت دیکھی

نگہِ شوق کی محرومیِ تقدیر نہ پوچھ
بن گئی وہ بھی فسانہ جو حقیقت دیکھی

حسنِ بے نام نے رکھا تھا چھپا کر جس کو
وہ تجلی بھی سرِ پردۂ حیرت دیکھی

اس گنہگارِ محبت کو خدا ہی سمجھے
جس نے اس مدھ بھری آنکھوں کی ندامت دیکھی

واعظ نے اور نہ زاہدِ شب زندہ دار نے
مجھ کو جگا دیا مرے دل کی پکار نے

تم کو غرورِ حسن ہے لیکن یہاں یہ فکر
چھوڑا ہے کس کو عشقِ دو عالم شکار نے

تسکینِ روح جب نہ کسی طرح ہو سکی
سب اپنی اپنی دھن میں لگے کچھ پکارنے

تکلیف صبر وہ وارِ تکلیف، الاماں!
مارا ہے مجھ کو خود مرے صبر و قرار نے

طنزاً وہ دیکھتے ہیں مگر دیکھتے تو ہیں
یہ کام تو کیا دلِ ناکردہ کار نے

وہ عشق ہی نہیں ہے، وہ دل ہی نہیں جگرؔ
لبیک خود کہا نہ جسے حسنِ یار نے

شبِ فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں ان کی توجہ بھی پائی جاتی ہے

یہ عمرِ عشق یوں ہی کیا گنوائی جاتی ہے
حیاتِ زندہ حقیقت بنائی جاتی ہے

بنا بنا کے جو دنیا مٹائی جاتی ہے
ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے

ہمیں پہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے
مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے

خدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے
وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے

گناہ گار کے دل سے نہ بچ کے چل زاہد
یہیں کہیں تری جنت بھی پائی جاتی ہے

نہ سوزِ عشق، نہ برقِ جمال پر الزام
دلوں میں آگ خوشی سے لگائی جاتی ہے

کچھ ایسے اب بھی ہیں رندانِ پاک باز جگر
کہ جن کو بے مے و ساغر پلائی جاتی ہے

نقابِ حسنِ دو عالم اُٹھائی جاتی ہے
مجھی کو میری تجلّی دکھائی جاتی ہے

قدم قدم مری ہمّت بڑھائی جاتی ہے
نفس نفس تری آہٹ سی پائی جاتی ہے

وہ اِک نظر جو بہ مشکل اُٹھائی جاتی ہے
وہی نظر رگ و پے میں سمائی جاتی ہے

سکوں ہے موت یہاں ذوقِ جستجو کے لیے
یہ تشنگی وہ نہیں جو بُجھائی جاتی ہے

خدا وہ دردِ محبت ہر ایک کو بخشے
کہ جس میں روح کی تسکین پائی جاتی ہے

وہ میکدہ ہے تری انجمن خدا رکھے
جہاں خیال سے پہلے پلائی جاتی ہے

ترے حضور یہ کیا وارداتِ قلب ہے آج
کہ جیسے چاند پہ بدلی سی چھائی جاتی ہے

تجھے خبر ہو تو اتنی نہ فرصتِ غم دے
کہ تیری یاد بھی اکثر ستائی جاتی ہے

وہ چیز، کہتے ہیں فردوسِ گم شدہ جس کو
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

قریبِ منزلِ آخر ہے الفراق جگر
سفر تمام ہوا، نیند آئی جاتی ہے

نہ اب مسکرانے کو جی چاہتا ہے
نہ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

ستانے نہیں وہ تو ان کی طرف سے
خود اپنے ستانے کو جی چاہتا ہے

کوئی مصلحت روک دیتی ہے ورنہ
پلٹ دیں زمانے کو جی چاہتا ہے

تجھے بھول جانا تو ہے غیر ممکن
مگر بھول جانے کو جی چاہتا ہے

تواضع کرالے عشق چند آنسوؤں سے
بہت مسکرانے کو جی چاہتا ہے

بہت دیر تک چھپ کے تیری نظر سے
تجھے دیکھ پانے کو جی چاہتا ہے

حسین تیری آنکھیں، حسین تیرے آنسو
یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

جگرؔ اب تو وہ بھی یہ کہتے ہیں مجھ سے
ترے ناز اٹھانے کو جی چاہتا ہے

جلوہ بہ قدرِ ذوقِ نظر دیکھتے رہے
کیا دیکھتے ہم ان کو مگر دیکھتے رہے

اپنا ہی عکس پیشِ نظر دیکھتے رہے
آئینہ رُو برو تھا جدھر دیکھتے رہے

کیا قہر تھا کہ پاس ہی دل کے لگی تھی آگ
اندھیر ہے کہ دیدۂ تر دیکھتے رہے

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے
بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے

ان کی حریمِ[۱] ناز کہاں اور ہم کہاں
نقش و نگارِ پردۂ در دیکھتے رہے

ایسی بھی کچھ فراق کی راتیں گزر گئیں
جیسے انھیں کو پیشِ نظر دیکھتے رہے

ہیں دورِ بے دلی کی وہ مجبوریاں بھی یاد
آنکھیں تھیں سوگوار مگر دیکھتے رہے

ہر لحظہ شانِ حُسن بدلتی رہی جگرؔ
ہر آن ہم جہانِ دگر دیکھتے رہے

---

۱؎ اس لفظ کی تذکیر میرے مذاقِ شعری کو پسند نہیں اور میں اس کو ہمیشہ تانیث استعمال کرتا ہوں۔ جگرؔ

یہ مصرع کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لیے تیار ہو جائے

وہی میخوار ہے جو اس طرح میخوار ہو جائے
کہ شیشہ توڑ دے اور بے پیے سرشار ہو جائے

دلِ انساں اگر شائستۂ اسرار ہو جائے
لبِ خاموشِ فطرت ہی لبِ گفتار ہو جائے

ہر اک بیکار سی ہستی بروئے کار ہو جائے
جنوں کی روحِ خوابیدہ اگر بیدار ہو جائے

سنا ہے حشر میں ہر آنکھ اسے بے پردہ دیکھے گی
مجھے ڈر ہے، نہ توہینِ جمالِ یار ہو جائے

حریمِ ناز میں اس کی رسائی ہو تو کیوں کر ہو
کہ جو آسودہ زیرِ سایۂ دیوار ہو جائے

معاذ اللہ! اس کی واردات غم، معاذ اللہ!
چمن جس کا وطن ہو اور چمن بیزار ہو جائے

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی
کہ انساں عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے

اک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھرتھرا اٹھے
نظر تلوار بن جائے نفس جھنکار ہو جائے

یہ روز و شب، یہ صبح و شام، یہ بستی، یہ ویرانہ
سبھی بیدار ہیں انساں اگر بیدار ہو جائے

محبت صلح بھی، پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

طبیعت اس طرف خوددار بھی ہے
اُدھر نازک مزاجِ یار بھی ہے

ادائے عشق، ادائے یار بھی ہے
بہت سادہ، بہت پُرکار بھی ہے

یہ فتنے جن سے اک دنیا ہے نالاں
انھی سے گرمیِ بازار بھی ہے

جنوں کے دم سے ہے نظمِ دو عالم
جنوں برہم زنِ افکار بھی ہے

نفس پر ہے مدارِ زندگانی
نفس چلتی ہوئی تلوار بھی ہے

اسی انسان میں سب کچھ ہے پنہاں
مگر یہ معرفت دشوار بھی ہے

وہ بوئے گل کہ ہے جانِ چمن بھی
قیامت ہے چمن بیزار بھی ہے

یہی دنیا ہے بستی آنسوؤں کی
یہی دنیا تبسم زار بھی ہے

جہاں وہ ہیں، وہیں میرا تصور
جہاں میں ہوں خیالِ یار بھی ہے

خبردار! اے سبک سارانِ ساحل
یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے

غنیمت ہے کہ اس دورِ ہوس میں
ترا ملنا بہت دشوار بھی ہے

جو کوئی سن سکے تو نکہتِ گل
شکستِ رنگ کی جھنکار بھی ہے

ان آنکھوں کی زہے معجز بیانی
بہم انکار بھی، اقرار بھی ہے

نہ تابِ مستی، نہ ہوشِ ہستی کہ شکرِ نعمت ادا کریں گے
خزاں میں جب ہے یہ اپنا عالم، بہار آئی تو کیا کریں گے
ہر ایک غم کو فروغ دے کر یہاں تک آراستہ کریں گے
وہی جو رہتے ہیں دور ہم سے، خود اپنی آغوش وا کریں گے
جدھر سے گزریں گے سرفروشانہ کارنامے سنا کریں گے
وہ اپنے دل کو ہزار روکیں، مری محبت کو کیا کریں گے
نہ شکرِ غم زیرِ لب کریں گے، نہ شکوہ برملا کریں گے
جو ہم پہ گزرے گی، دل ہی دل میں کہا کریں گے، سنا کریں گے
ترے تصور سے حاصل اتنا کمال کسبِ ضیا کریں گے
جہاں کچھ آنسو ٹپک پڑیں گے، ستارے سجدے کیا کریں گے
یہ ظاہری جلوہ ہائے رنگیں فریب کب تک دیا کریں گے
نظر کی جو کر سکے نہ تسکیں، وہ دل کی تسکین کیا کریں گے

وہاں بھی آہیں بھرا کریں گے، وہاں بھی نالے کیا کریں گے
جنھیں ہے تجھ سے ہی صرف نسبت، وہ تیری جنّت کو کیا کریں گے

نہیں ہے جن کو مجالِ ہستی، سوائے اس کے وہ کیا کریں گے
کہ جس زمیں کے ہیں بسنے والے، اسے بھی رُسوا کیا کریں گے

یہاں نہ دُنیا نہ فکرِ دُنیا، یہاں نہ عقبےٰ نہ فکرِ عقبےٰ
جنھیں سرِ ماسوا بھی ہوگا، وہی غمِ ماسوا کریں گے

ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں، ہم اپنی کیوں طرزِ خاص بدلیں
کہ انقلابات نو بہ نو تو ہوا کیے ہیں، ہوا کریں گے

یہ سخت تر عشق کے مراحل، یہ ہر قدم پر ہزار احساں
جو بچ رہے تو جنوں کے حق میں جہاں گے جب تک، دُعا کریں گے

یہ خام کارانِ عشق سوچیں، یہ شکوہ سنجانِ حُسن سمجھیں
کہ زندگی جب یہیں نہ ہوگی تو پھر توجہ وہ کیا کریں گے

خود اپنے ہی سوزِ باطنی سے نکال اِک شمعِ غیر فانی
چراغِ دیر و حرم تو اے دل، جلا کریں گے، بُجھا کریں گے

کس کا خیال، کون سی منزل نظر میں ہے
صدیاں گزر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

چہرے پہ برہمی ہے تبسم نظر میں ہے
اب کیا کمی تباہیِ قلب و جگر میں ہے

اک روشنی سی آج ہر اک دشت و در میں ہے
کیا میرے ساتھ خود مری منزل سفر میں ہے

تسلیم حسنِ دوست کی معصومیاں مگر
شامل کوئی تو فتنۂ شام و سحر میں ہے

صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں
اک لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

یارب! وفائے عذرِ محبت کی خیر ہو
نازک سا اعتراف بھی آج اس نظر میں ہے

سمجھے تھے دور تجھ سے نکل جائیں گے کہیں
دیکھا تو ہر مقام تری رہ گزر میں ہے

کاریگرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

زندگی ہے مگر پرائی ہے
مرگِ غیرت! تری دہائی ہے

جب مسرت قریب آئی ہے
غم نے کیا کیا ہنسی اُڑائی ہے

حُسن نے جب شکست کھائی ہے
عشق کی جان پر بن آئی ہے

عشق کو زعمِ پارسائی ہے
حسنِ کافر! تری دہائی ہے

ہائے وہ سبزۂ چمن کہ جسے
سایۂ گُل میں نیند آئی ہے

عشق ہی اس مقام پر کہ جہاں
زندگی نے شکست کھائی ہے

خاک منزل کو منہ سے ملتا ہوں
یادگارِ شکستہ پائی ہے

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

ہجر سے شاد، وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگرؔ نے پائی ہے

اگر جمالِ حقیقت سے ربطِ محکم ہے
نفس نفس میں نئی زندگی کا عالم ہے

نہیں مقابلہ کوئی مگر یہ کیا کم ہے
خود آفتابِ درخشاں حریفِ شبنم ہے

الٰہی خیر! یہ کیا شام ہی سے عالم ہے
کہ جیسے آج ستاروں میں روشنی کم ہے

نہ کوئی خلد، نہ زاہد! کوئی جہنم ہے
خود اپنی اپنی نظر اپنا اپنا عالم ہے

ہر ایک قطرے میں دریائے معرفت ہی رواں
مگر نصیب ہو کیوں کر کہ پیاس ہی کم ہے

ابھی کمال کو پہنچی نہیں ہے فطرتِ عشق
کہ آدمی کو ہنوز انتظارِ آدم ہے

جنوں بھی ساتھ نہ دے اب تو کچھ نہیں پروا
خوشا کہ تیری نگاہوں سے ربطِ محکم ہے

جو گوشِ دل شنوا ہو تو بزمِ ہستی میں
سکوتِ ساز بھی اک نغمۂ مجسّم ہے

خزاں کا رنج کرے عشق میں بلا میری
نہیں بہار تو یادِ بہار کیا کم ہے

حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرتِ شاعر
ہنسے تو غنچہ و گل، رو پڑے تو شبنم ہے

خوشی میں بھول نہ جانا مگر یہ رازِ حیات
کہ جو خوشی ہے یہاں، اک امانتِ غم ہے

حسن و صورت کے نہ حسرت کے نہ ارمانوں کے
اُف! کہ انسان ہیں مارے ہوئے انسانوں کے

کیا مقامات ہیں اِن سوختہ سامانوں کے
خضر خود بڑھ کے قدم لیتے ہیں دیوانوں کے

اٹھی ذرّات سے ہیں خامُش سے ویرانوں کے
دل دھڑکتے نظر آئے مجھے انسانوں کے

جلوۂ دوست! یہ آہستہ خرامی تاچند
ندّیاں سوکھ چلیں شوق میں طوفانوں کے

موجِ مے، رنگِ شفق، لالہ و گُل، مطلعِ صبح
چند عنواں ہیں مرے شوق کے افسانوں کے

اسی کشتی کو نہیں تابِ تلاطم صد حیف!
جس نے منہ پھیر دیئے تھے کبھی طوفانوں کے

کس کا خیال ہے دلِ مضطر لیے ہوئے
آنکھیں ہیں رنگ و بوئے گُلِ تر لیے ہوئے

آئی ہے موت حسن کا منظر لیے ہوئے
لیکن غمِ حیاتِ مکرر لیے ہوئے

ہر لحظہ اک سرورِ میسر لیے ہوئے
خود زندگی ہی بادہ و ساغر لیے ہوئے

ہشیار اے نگاہِ ستم آشنائے دوست
دل بھی ہے اک لطیف سا نشتر لیے ہوئے

کونین کی ہوس میں ہے انسان ذلیل و خوار
کونین اپنے سینے کے اندر لیے ہوئے

دُنیا بھی کیا مقام ہے جس میں کہ بارہا
ہنسنا پڑا ہی قلبِ مکدّر لیے ہوئے

شرمِ گنہ سے بڑھ کے ہی عفوِ گنہ کی شرم (ق)
یارب! کہاں میں جاؤں یہ نشتر لیے ہوئے

عصیاں کا بار ہٹ تو گیا سر سے اے کریم
لیکن ہوں ایک بوجھ سا دل پر لیے ہوئے

---

اللہ رے بے بسی کہ غمِ روزگار بھی
بیٹھا ہوں تیرے غم کے برابر لیے ہوئے

اُف رے تجلّیِ رُخِ ساقی کہ بادہ کش
رہ رہ گئے ہیں ہاتھ میں ساغر لیے ہوئے

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگر
پھرا کی قتل گاہ کا منظر لیے ہوئے

رازِ جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

سخت خونریز جب آشوبِ جہاں ہوتا ہے
نہیں معلوم یہ انسان کہاں ہوتا ہے

جب کوئی حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے
ذرہ ذرہ مری جانب نگراں ہوتا ہے

جو نظر کردۂ صاحب نظراں ہوتا ہے
اسی دیوانے کے قدموں پہ جہاں ہوتا ہے

جب کوئی عشق میں بربادِ جہاں ہوتا ہے
مجھ کو محسوس خود اپنا ہی زیاں ہوتا ہے

منزل ہے ادب گاہِ محبت کی زمیں
کوئی دیکھے تو یہ ہنگامہ کہاں ہوتا ہے

کہیں ایسا تو نہیں، وہ بھی ہو کوئی آزار (ق)
تجھ کو جس چیز پہ راحت کا گماں ہوتا ہے

دل غنی ہو تو ہر اک رنج بھی دل کی راحت
ذہن مفلس ہو تو ہر سود زیاں ہوتا ہے

امتحاں گاہِ محبت میں نہ رکھے وہ قدم
موت کے نام سے جس کو خفقاں ہوتا ہے

یہی وہ منزلِ دشوار ہے جس منزل میں
ختم ہر مرحلۂ سود و زیاں ہوتا ہے

ہر قدم معرکۂ کرب و بلا ہے درپیش
ہر نفس سانحۂ مرگِ جواں ہوتا ہے

ناز جس خاکِ وطن پر تھا مجھے آہ، جگر
اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے / اہلِ دل کے لیے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

ہائے وہ وقت کہ جب حسن پہ آتا ہے شباب / اُف وہ ہنگام کہ جب عشق جواں ہوتا ہے

کبھی اِک زندہ حقیقت نظر آتا ہے جہاں / کبھی ہر علم و یقیں وہم و گماں ہوتا ہے

دل کو بے دردِ محبت میں بتانے والے! / دل سا ہمدرد زمانے میں کہاں ہوتا ہے

وقت آتا ہے اِک ایسا بھی محبت میں کہ جب / دل پہ احساسِ محبت بھی گراں ہوتا ہے

ہائے وہ سلسلۂ اشک کہ جو تیرے حضور / دل میں رکتا ہے نہ آنکھوں سے رواں ہوتا ہے

عزمِ بیباک اگر ہو تو کہاں کی دُوری / حسن خود منتظرِ عشقِ جواں ہوتا ہے

شرحِ تفصیل سے بیگانہ گزر جائے دوست (قطعہ) / عقل بڑھتی ہے مگر دل کا زیاں ہوتا ہے

روح بن جاتی ہے خود نغمۂ بے ساز و صدا / ختم جب معرکۂ سود و زیاں ہوتا ہے

وسعتِ فکر و نظر بھی نہ مجھے راس آئی (قطعہ) / ہر تبسّم پہ جراحت کا گماں ہوتا ہے

ساز و مطرب کے کرشموں پہ نہ جانا کہ یہاں / اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے

انقلابات سے کیا خوف کہ ہر عزمِ جگر

اسی آغوش میں پلتا ہے جواں ہوتا ہے

آج بھی یوں تو ہر اک رِند جواں ہے ساقی
مگر اک آن جو پہلے تھی، کہاں ہے ساقی

زندگی سلسلۂ خوابِ گراں ہے ساقی
لا تو وہ فتنۂ بیدار کہاں ہے ساقی

حرم و دیر کا چھٹنا تو گوارا لیکن
دل کو آرام وہاں تھا، نہ یہاں ہے ساقی

طنز و تعریض کی آخر کوئی حد ہوتی ہے
آدمی ہوں، مرے مُنہ میں بھی زباں ہے ساقی

اپنے منصب کا نہ احساس نہ رِندوں کی خبر
دیر سے آج خدا جانے کہاں ہے ساقی

زیست ہے یا تری نظروں کے اشاراتِ لطیف
موجِ صہبا ہے کہ فردوس رواں ہے ساقی

ہر وہ حلقہ جو تری کاکلِ شب گیر میں ہے
گوشۂ امنِ بلا خانۂ زنجیر میں ہے

شاہدِ روح کہاں، جلوہ گہِ ناز کہاں
خاک مصروف ابھی خاک کی تعمیر میں ہے

کون سمجھائے یہ قاصد کو دمِ رخصتِ شوق
ربطِ محکم اسی بے ربطیِ تحریر میں ہے

اپنے سر آپ لیں دل شکنی کا الزام
مجھ کو معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے

خود کھنچے آتے ہیں زنداں کی طرف دیوانے
کوئی تو وجہِ کشش نالۂ زنجیر میں ہے

دیکھنا جبرِ مشیّت کہ بقیدِ زنداں
پاؤں زنجیر سے باہر ہے نہ زنجیر میں ہے

چھپ کے پھروں اسے اے دیکھنے والے نہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے

شرما گئے، لجا گئے، دامن چھڑا گئے
اے عشق! مرحبا، وہ یہاں تک تو آگئے

دل پر ہزار طرح کے اوہام چھا گئے
یہ تم نے کیا کیا، مری دنیا میں آگئے

سب کچھ لٹا کے راہِ محبت میں اہلِ دل
خوش ہیں کہ جیسے دولتِ کونین پا گئے

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

عقل و جنوں میں سب کی تھیں راہیں جدا جدا
ہر پھر کے لیکن ایک ہی منزل پہ آگئے

اب کیا کروں میں فطرتِ ناکامِ عشق کو
جتنے تھے حادثات مجھے راس آگئے

یوں تو ہونے کو گلستاں بھی ہے ویرانہ بھی ہے
دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں کوئی دیوانہ بھی ہے

بات سادہ ہی سہی لیکن حکیمانہ بھی ہے
یعنی ہر انساں بقدرِ ہوش دیوانہ بھی ہے

ہوشیار، اے مستِ صہبائے تغافل، ہوشیار
عشق کی فطرت میں اک شانِ حریفانہ بھی ہے

ہوش میں رہتا تو کیا جانے کہاں رکھتا قدم
یہ غنیمت ہے، مزاجاً عشق دیوانہ بھی ہے

کس جگہ واقع ہوا ہے حضرتِ واعظ کا گھر
دور مسجد بھی نہیں، نزدیک میخانہ بھی ہے

ملتا جلتا ہے مزاجِ حسن ہی سے رنگِ عشق
شمع گر بیباک ہے، گستاخ پروانہ بھی ہے

زندگانی تا کجا صرفِ مے و جام و سبو
بے خبر، میخانے میں اک اور میخانہ بھی ہے

خیر، ہے زاہد، یہ کیسا انقلاب آیا کہ آج
تیرے ہر انداز میں اک کیفِ رندانہ بھی ہے

حاصلِ ہر جستجو آخر یہی نکلا جگر
عشق خود منزل بھی ہے، منزل سے بیگانہ بھی ہے

ہر تجلّی یہیں نظر آئی
اُف رے تیری حجاب آرائی

دل نے لغزش جہاں کوئی کھائی
ایک آواز کان میں آئی

زندگی! تُو ہمیں کہاں لائی
اک محبّت، ہزار رُسوائی

مجھ کو شکوہ ہے اپنی آنکھوں سے
تم نہ آئے تو نیند کیوں آئی

نیچی نظروں سے دیکھنے والے
دیکھنا زخمِ دل کی گہرائی

عشق کی بدحواسیاں توبہ!
بارہا خود مجھے ہنسی آئی

عشق میں، عشق کی بلا جانے
ناپذیرائی و پذیرائی

دو دل اس طرح مل گئے ناگاہ
جیسے برسوں کی ہو شناسائی

پھول بننا تھا، مُسکرانا تھا
وہ کلی ہی نہ تھی، جو مُرجھائی

کارگاہِ حیات میں اے دوست (ق) یہ حقیقت مجھے نظر آئی

ہر اُجالے میں تیرگی دیکھی
ہر اندھیرے میں روشنی پائی

---

اب یہ محسوس ہو چلا ہے جگرؔ
موت ہے زندگی کی تنہائی

اب وہ ہے کافر جو نہ پیے　　خود وہ اُٹھے ہیں جام لیے
کوئی مَرے یا کوئی جیے　　اِن کی بَلا سے ان کے لیے
ہم بھی گرے سو بار جگر
ان کو بھی اپنے ساتھ لیے

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

تنگ میخانہ تھا میں، ساقی نے یہ کیا کر دیا
پینے والے کہہ اُٹھے "یا پیرِ میخانہ" مجھے

لالہ و گل، موج و دریا، انجم و خورشید و ماہ
اک تعلق سب سے ہے لیکن رقیبانہ مجھے

زندگی میں آ گیا جب کوئی وقتِ امتحاں
اس نے دیکھا ہے جگرؔ بے اختیارانہ مجھے

آ پڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایّام سے
زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے

جب کبھی بچ کر چلا ہوں جلوہ گاہِ عام سے
بچ گئے ہیں خود مری فکر و نظر کے دام سے

کچھ انھیں بھی ربط میری حسرتِ ناکام سے
اور کچھ میں بھی گریزاں التفاتِ عام سے

ہو گیا ہے درہم و برہم نظامِ میکدہ
جب کبھی توبہ مری ٹکرا گئی ہے جام سے

ان کی محفل کا تو کیا کہنا، مگر اے ہم نشیں
رنگِ محفل کہہ رہا ہے دل ہیں بے آرام سے

آج کل مے خانے میں تقسیم ہوتے ہیں جگر
زہر کے ساغر شرابِ زندگی کے نام سے

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیوں کر دل بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے

ضد پر عشق اگر آ جائے
پانی چھڑکے آگ لگائے

دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے
بھاگے، لیکن راہ نہ پائے

کیسا مجاز اور کیسی حقیقت
اپنے ہی جلوے، اپنے ہی سائے

جھوٹی ہے ہر ایک مسرّت
روح اگر تسکین نہ پائے

کارِ زمانہ جتنا جتنا
بنتا جائے بگڑتا جائے

ضبطِ محبت، شرطِ محبت
جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے

حسن وہی ہے حسن، جو ظالم (ق)
ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سُنے اور روح سُنائے

---

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

صحنِ کعبہ نہ سہی، کوئے صنم خانہ سہی
خاک اڑانی ہے تو پھر کوئی بھی ویرانہ سہی

زندگی تلخ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اس میں کچھ چاشنیِ مشربِ رندانہ سہی

آپ سے جس کو ہو نسبت، وہ جنوں کیا کم ہے
دونوں عالم نہ سہی، اک دلِ دیوانہ سہی

اپنی شوریدہ مزاجی کو کہاں لے جاؤں
تیرا ایما نہ سہی، تیرا اشارا نہ سہی

زندگی فرشِ قدم بن کے بچھی جاتی ہے
اے جنوں! اور بھی اک لغزشِ مستانہ سہی

یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ فضائیں، یہ بہار
محتسب آج تو شغلِ مے و پیمانہ سہی

حسن جو پردہ کشائے رخِ مقصود ہے تو
عشق کو حوصلۂ عرضِ تمنا نہ سہی

کون ایسا ہے یہاں، عشق ہی جس کا بے لاگ
آپ کی جان سے دور، آپ کا دیوانہ سہی

زندگی آج بھی دل کش ہے انھیں کے دم سے
حسن اک خواب سہی، عشق اک افسانہ سہی

تشنہ لب ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
کچھ نہیں ہے تو شکستِ خم و خم خانہ سہی

میں نہ زاہد سے ہوں شرمندہ نہ صوفی سے جگرؔ
مسلکِ عشق مرا مسلکِ رندانہ سہی

یہ راز ہم پر ہوا نہ افشا کسی کی خاص اِک نظر سے پہلے
کہ تھی ہماری ہی کم نگاہی، ہمیں تھے کچھ بے خبر سے پہلے

یہ زندگی خاک زندگی تھی، گدازِ قلب و جگر سے پہلے
ہر ایک سے غیر معتبر تھی، ترے غمِ معتبر سے پہلے

تجھے ہو سیرِ چمن مبارک، مگر یہ رازِ چمن بھی سُن لے
کلی کلی خون ہو چکی تھی، شگفتِ گل ہائے تر سے پہلے

کہاں کہاں اُڑ کے پہنچے شعلے یہ ہوش کس کو یہ کون جانے
ہمیں بس اتنا ہے یاد اب تک، لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے

قفس کی نازک سی تیلیوں کی بھی کچھ حقیقت ہے اہم صفیرو
مگر الجھنا پڑے گا شاید خود اپنے ہی بال و پر سے پہلے

کہاں یہ شورش، کہاں یہ مستی، کہاں یہ رنگینیوں کا عالم
زمانہ خواب و خیال سا تھا، ترے فسونِ نظر سے پہلے

خوشا یہ بیماریِ محبت، زہے یہ خودداریِ طبیعت
وہی ہیں معروفِ دل نوازی وہی جو تھے بے خبر سے پہلے

زمانہ مانے نہ مانے لیکن، ہمیں یہی ہے یقینِ کامل
جہاں اُٹھا کوئی تازہ فتنہ، اُٹھا تری رہ گزر سے پہلے

اگرچہ ذوقِ نظارہ میں بھی ہزار سرمستیاں بھری تھیں
مگر یہ بےباکیاں کہاں تھیں، ترے حجابِ نظر سے پہلے

اٹھا جو چہرے سے پردہ شب، سمٹ کے مرکز پہ آگئے سب
تمام جلوے جو منتشر تھے، طلوعِ حسنِ بشر سے پہلے

مری طبیعت کو حسنِ فطرت سے ربطِ باطن نہ جانے کیا ہے
مری نگاہیں کبھی نہ اٹھیں طہارتِ چشمِ تر سے پہلے

وہ یادِ آغازِ عشق اب تک انیسِ جان و دلِ حزیں ہے
وہ اک جھجک سی، وہ اک جھجک سی ہر التفاتِ نظر سے پہلے

ہمیں تھے کیا جستجو کا حاصل، ہمیں تھے کیا آپ اپنی منزل
وہیں پہ آکر ٹھہر گیا دل، چلے تھے جس رہ گزر سے پہلے

بس ایک دل اور کیف و لذت، بس ایک ہم اور جمالِ فطرت
یہ زندگی کس قدر حسیں تھی، شعورِ فکر و نظر سے پہلے

ہمارے شوقِ جنوں ادا کی ستم ظریفی تو کوئی دیکھے
کہ نامہ بر کو روانہ کر کے پہنچ گئے نامہ بر سے پہلے

کہاں تھی یہ روح میں لطافت، کہاں تھی کونین میں یہ وسعت
حیات ہی سو رہی تھی جیسے کسی کی پہلی نظر سے پہلے

یہ نالہ کیوں ہے؟ یہ نغمہ کیوں ہے؟ یہ آہ کیسی؟ یہ واہ کیسی؟
یہ پوچھ لے آئینے کے دل سے نہ پوچھ اپنے جگر سے پہلے

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے

جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گزرے
کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گزرے

مجھے یہ وہم رہا مدتوں کہ جرأتِ شوق
کہیں نہ خاطرِ معصوم پر گراں گزرے

ہر اک مقامِ محبت بہت ہی دلکش تھا
مگر ہم اہلِ محبت کشاں کشاں گزرے

جنوں کے سخت مراحل بھی تیری یاد کے ساتھ
حسیں حسیں نظر آئے جواں جواں گزرے

مری نظر سے تری جستجو کے صدقے میں
یہ اک جہاں ہی نہیں سینکڑوں جہاں گزرے

ہجومِ جلوہ میں پروازِ شوق کیا کہنا
کہ جیسے روح ستاروں کے درمیاں گزرے

خطا معاف، زمانے سے بدگماں ہو کر
تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گزرے

مجھے تھا شکوۂ ہجراں کہ یہ ہوا محسوس
مرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گزرے

رہِ وفا میں اِک ایسا مقام بھی آیا
کہ ہم خود اپنی طرف سے بھی بدگماں گزرے

خلوص جس میں ہو شامل، وہ دورِ عشق و ہوس
نہ رائیگاں کبھی گزرا نہ رائیگاں گزرے

اسی کو کہتے ہیں جنت اسی کو دوزخ بھی
وہ زندگی جو حسینوں کے درمیاں گزرے

بہت لطیف مناظر بھی حسنِ فطرت کے
نہ جانے آج طبیعت پہ کیوں گراں گزرے

وہ جن کے سائے سے بھی بجلیاں لرزتی تھیں
مری نظر سے کچھ ایسے بھی آشیاں گزرے

مرا تو فرض چمن بندیِ جہاں ہے فقط
مری بلا سے بہار آئے یا خزاں گزرے

کہاں کا حسن کہ خود عشق کو خبر نہ ہوئی
رہِ طلب میں کچھ ایسے بھی امتحاں گزرے

بھری بہار میں تاراجیِ چمن مت پوچھ
خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے

کوئی نہ دیکھ سکا جن کو دو دلوں کے سوا
معاملات کچھ ایسے بھی درمیاں گزرے

کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد
طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گزرے

بہت حسین ہیں صحبتیں گلوں کی مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گزرے

ابھی سے مجھ کو بہت ناگوار ہیں ہمدم
وہ حادثات جو اب تک رواں دواں گزرے

جنھیں کہ دیدۂ شاعر ہی دیکھ سکتا ہے
وہ انقلاب مرے سامنے کہاں گزرے

بہت عزیز ہے مجھ کو انھیں کی یاد جگرؔ
وہ حادثاتِ محبت جو ناگہاں گزرے

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

بھول جاتا ہوں میں ستم اس کے
وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

آج کیا بات ہے کہ پھولوں کا
رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

سلسلہ فتنۂ قیامت کا
تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا
ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

کاروبار جہاں سنورتے ہیں
ہوش جب بے خودی سے ملتا ہے

روح کو بھی مزا محبت کا
دل کی ہم سائیگی سے ملتا ہے

وہ سبزہ ننگِ چمن ہے جو لہلہا نہ سکے
وہ گُل ہے زخمِ بہاراں جو مسکرا نہ سکے

یہ آدمی ہے وہ پروانہ شمعِ دانش کا
جو روشنی میں رہے، روشنی کو پا نہ سکے

نہ ہے خلوصِ محبت کہ حادثاتِ جہاں
مجھے تو کیا مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے

نہ جانے آہ کہ اِن آنسوؤں پہ کیا گزری
جو دل سے آنکھ تک آئے، مژہ تک آ نہ سکے

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل
جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے

مری نظر نے شبِ غم انھیں بھی دیکھ لیا
وہ بے شمار ستارے جو جگمگا نہ سکے

یہ مہر و ماہ مرے ہم سفر رہے برسوں
پھر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے

گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے ورنہ
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے
نئی زمین، نیا آسماں بنا نہ سکے

انھیں سعادتِ منزل رسی ہو کیا حاصل
وہ پاؤں راہِ طلب میں جو ڈگمگا نہ سکے

صدا آرزوئے خوشگوار و سرگراں سی لیے ہوئے
پھر اگر رہے گی زندگی کہاں کہاں لیے ہوئے

ہوا نہ دل ہی مُلتفت اگرچہ مُدّتوں کے بعد
شمیمِ دوست آئی تھی قرارِ جاں لیے ہوئے

خوشا حیاتِ عاشقاں کہ موت بھی جب آئی ہے
تو ساتھ ایک حلقۂ پری وشاں لیے ہوئے

ترس رہی ہے زندگی، برس رہی ہے زندگی
نفس نفس میں تشنگی کی داستاں لیے ہوئے

اب اُس مقامِ عشق سے گزر رہا ہوں میں جگرؔ
کہ ظلمتیں بھی ہیں جہاں تجلّیاں لیے ہوئے

نہ بدلے بحر کو بھی تشنگی سے
تعجب کیا مزاجِ عاشقی سے

نظر آتے ہیں ہم سب آدمی سے
مگر کہیے تو کیا کہیے کسی سے

خزانے بھر لیے ہیں اہلِ دل نے
ترے مستوں کے دامانِ تہی سے

وہی دل ہے مگر اے حسنِ جاناں
کسے فرصت جہادِ زندگی سے

مرا کفرِ محبت اللہ اللہ!
شعاعیں پھوٹ نکلیں تیرگی سے

خبر لے اپنے میخانے کی ساقی
اُٹھے شعلے مرے جامِ تہی سے

تجھے ایک ایک شک ہے راہِ منزل
نشانِ راہ پاتا ہوں اسی سے

تمنّا ہے اماں مل جائے یارب
جہنّم کو مری تر دامنی سے

بحمد اللہ جنونِ عشق پہنچا
بہت آگے مقامِ آگہی سے

کتابوں میں دھرا ہی کیا ہے واعظ
سبق لے زندگی کا زندگی سے

کیا اُجیاری کیسی اندھیری — دن ہے تیرا، رات نہ میری

سمجھے کوئی بات نہ میری — سورج سر پر، رین اندھیری

میرا مسلک تشنہ دہانی — تجھ کو مبارک مشربِ سیری

چڑھتے آئیں کالے طوفاں — کھیلتی جائے کشتی میری

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں — دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

شرم، کہ تیرے دیکھنے والے
صورت دیکھیں تیری میری

ہمت جو ہو بلند تو کچھ اس سے کام لے
ساقی کا انتظار نہ کر، بڑھ کے جام لے

قیمت غمِ حیات کی تو دام دام لے
یعنی بہار ہو کہ خزاں سب سے کام لے

دھوکا ہوا نہ ہو کہیں تجھ کو نسیمِ شوق
وہ اور ہم سے خاک نشینوں کا نام لے

جو تلخیِ عمل کو گوارا بنا سکے
یوں ہو سکے تو لذتِ حسنِ کلام لے

تو عینِ زندگی سے گریزاں تو ہے مگر
تیری ہی زندگی نہ کہیں انتقام لے

جینے کو یوں تو ہم بھی جیے جاتے ہیں مگر
یہ زندگی اسی کی ہے جو اس سے کام لے

میں اور مجھ کو صرف تمنائے رنگ و بو
جو خام ہو وہ ساغرِ صہبائے خام لے

مجھ کو نہیں قبول یہ تفریقِ خاص و عام
ساقی یہ اپنا شیشہ اٹھا اپنا جام لے

یہ شورشِ حیات، یہ آشوبِ روزگار
ایسے میں کون فتنۂ محشر کا نام لے

کر وقت کا شکار جگر دیکھتا ہے کیا
اس صیدِ برق پا کو بھی ہاں زیرِ دام لے

صیّاد پہ ظاہر ابھی یہ راز نہیں ہے
پرواز اسیرِ پرِ پرواز نہیں ہے

حالاں کہ وہ اب مرحمتِ ناز نہیں ہے
خوش ہوں کہ مرا غم نظرانداز نہیں ہے

جو سب کے لیے مونس و دمساز نہیں ہے
کچھ اور ہے وہ عشق کی آواز نہیں ہے

کیا قحطِ محبت ہے کہ اس دورِ ہوس میں
دل باز بہت ہیں کوئی جانباز نہیں ہے

میں طائرِ آوارہ و رسوا ہی سہی لیکن
محدودِ چمن تک مری پرواز نہیں ہے

آنکھیں ہوں حسیں تو وہ کون سا ذرہ ہے جو اے دوست
خود اپنی جگہ انجمنِ ناز نہیں ہے

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم، خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

اک تہی حسنِ یقیں تسکینِ جان و دل سہی
مجھ سے تو غافل نہیں ہے تجھ سے میں غافل سہی

جو بھی مل جائے محبت میں وہی انعامِ دوست
دردِ محرومی سہی، کیفِ شکستِ دل سہی

پھر بھی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اک سراپا ناز کو
زندگی میں ہر تجلّی حُسن کی شامل سہی

پھر بھی کتنی دل نشیں ہے، پھر بھی کتنی جاں فزا
حسن کی اک اک ادا ظالم سہی قاتل سہی

عشق ہی کی فطرتِ سرکش کا لیکن کیا علاج
ہر نفس رہبر سہی، جادہ سہی، منزل سہی

کس کو ملتی ہے جگرؔ یہ دولتِ بیدار بھی
لاکھ جامِ جم کے بدلے ایک ٹوٹا دل سہی

جب ہر اِک شورشِ غم ضبطِ فغاں تک پہنچے
پھر خدا جانے یہ ہنگامہ کہاں تک پہنچے

آنکھ تک دل سے نہ آئے نہ زباں تک پہنچے
بات جس کی ہے اُسی آفتِ جاں تک پہنچے

کیا تعجّب کہ مری روحِ جواں تک پہنچے
پہلے کوئی مرے نغموں کی زباں تک پہنچے

حسن کے نغمے بھی خاموش زباں تک پہنچے
اب ترے حوصلے اے عشق یہاں تک پہنچے

بڑھ کے رندوں نے قدم حضرتِ واعظ کے لیے
گرتے پڑتے جو درِ پیرِ مُغاں تک پہنچے

کیا خبر تجھ کو کہ تو نے جسے بھڑکایا تھا
وہی اِک شعلۂ نم ناک کہاں تک پہنچے

میرے اشعار میں جو آگ بھری ہے اے کاش!
تجھ کو راس آئے، ترے عزمِ جواں تک پہنچے

رہِ عرفاں میں اِک ایسا بھی مقام آتا ہے
ہر یقیں بڑھ کے جہانِ وہم و گماں تک پہنچے

اُف وہ کیفیتِ غم، آنکھ جسے دیکھ سکے
ہائے وہ درد کی لذت جو زباں تک پہنچے

تو جہاں آج سے پہلے تھا وہیں آج بھی ہے
دیکھ رندانِ خوش انفاس کہاں تک پہنچے

جو زمانے کو بُرا کہتے ہیں خود ہیں وہ بُرے
کاش یہ بات ترے گوشِ گراں تک پہنچے

تو مرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جلوے بیتاب تھے جو پردۂ فطرت میں جگرؔ
خود تڑپ کر مری چشمِ نگراں تک پہنچے

طوفاں کو موج، موج کو طوفاں نہ کر سکے

وہ کون سا ہے کام جو انساں نہ کر سکے

ہم شکوہ سنجیِ غمِ دوراں نہ کر سکے

اپنے سوا کسی کو پشیماں نہ کر سکے

شرمندۂ جنونِ محبّت نہیں اگر

ہم احتیاطِ دست و گریباں نہ کر سکے

محبّت زندگی ہی زندگی ہے		مگر تجھ بِن مرے کس کام کی ہے
وہی ساقی وہی دریا دلی ہے		وہی میں ہوں، وہی آب تشنگی ہے
شہیدانِ محبّت سو رہے ہیں		مگر روحِ صداقت جاگتی ہے
ہٹو رستے سے ای شیخ و برہمن		مرے دل نے مجھے آواز دی ہے
بہت جاں کاہ ہے بربادیِ دل		مگر کیا حسن ہے کیا دل کشی ہے

ہوا جاتا ہے ربطِ شوق عریاں
تکلّف برطرف کیا برہمی ہے

لب ترستے ہیں التجا کے لیے — ہاتھ اُٹھتے نہیں دُعا کے لیے

ایک جانِ عزیز کیا شے ہے — لاکھ جانیں ادا ادا کے لیے

ہم نے تنہائیوں میں کیا کیا لطف — ایک آوازِ بے صدا کے لیے

مجھ کو جو چاہو ناصحو کہہ لو — کچھ نہ کہنا اُسے خدا کے لیے

پھول کو رنگ و رامش و نکہت — اور آوارگی صبا کے لیے

آسماں کو ہیں گردشیں کیا کیا — اِک اسی خاکِ زیرِ پا کے لیے

ہم نے دانستہ بھی خطائیں کیں — ایک لطفِ ستم نما کے لیے

ہو جو ذوقِ جمال بے پایاں — کیا نہیں چشمِ آشنا کے لیے

عشق کی وسعتیں خدا کی پناہ! — حوصلہ چاہیے وفا کے لیے

اے جگرؔ آپ اور ایسی چُپ
کچھ تو فرمائیے خدا کے لیے

یہ سب لالہ و گُل، یہ سب چاند تارے
ترے اِک تبسّم کے چند استعارے

یہ موج و تلاطم، یہ طوفاں، یہ دھارے
اگر حوصلہ ہو تو یہ بھی سہارے

رہِ جُستجو میں تلاشِ خضر کیا
وہیں اپنی منزل جہاں دل پکارے

مجھے راہبر کی ضرورت نہیں ہے
سلامت مری لغزشوں کے سہارے

# افشاں

لطیف طبع کو لازم ہے سوزِ غم بھی لطیف
چمن میں آتشِ گُل کا کبھی دھواں نہ رہا

---

ہم نامرادِ شوق جیے بھی تو کیا جیے
آنا تھا مُفت یہ بھی اِک الزام، آگیا
کیا کیا نگاہِ دوست ہوئی مجھ سے بدگماں
دَم بھر کے واسطے بھی جو آرام، آگیا

---

کچھ اب اور ہی پا کے منشا کسی کا
اُلٹنا پڑا مجھ کو رُخ زندگی کا
بایں عقل و دانش، بایں علم و حکمت
بشر پھر بھی پُتلا ہے کم مائیگی کا

---

اس جگہ آج غمِ عشق کا عالم پایا
حُسن کو خود بھی جہاں شوقِ مجسّم پایا

---

اپنی بربادیٔ پیہم کا خیال آ ہی گیا
غیرتِ عشق کے چہرے پہ جلال آ ہی گیا
زندگی سخت مقامات سے گزری لیکن
وقت پر کام مرا جامِ سفال آ ہی گیا

---

مجھ سے اُلٹا انھیں شکوہ ہے ستم گاری کا
اے جنوں! خواب کا عالم ہو کہ بیداری کا

---

کیا کرے گا وہ کسی اور کا شیدا ہو کر
جس نے اپنے کو نہ سمجھا کبھی اپنا ہو کر

طعن کیا کیا نہ فرشتوں نے کیے تھے جن پر
عرش پیما ہے وہی خاک کا پُتلا ہو کر

ہے جو ملنا ہی مقدّر تو برابر سے ملے
قطرہ دریا میں سمائے بھی تو دریا ہو کر

---

بُجھے گی سوزِ غم سے روح کی پیاس
اسی شعلے کو بن جانا ہے شبنم

---

ان کی جفا پہ ترکِ وفا کر رہا ہوں میں
سارے کو زندگی سے جدا کر رہا ہوں میں

میری ادائے شکرِ حضوری تو دیکھنا
صد شکوۂ فراق ادا کر رہا ہوں میں

---

اللہ اللہ! آج حسنِ دوست کی غمازیاں
عشق ہی کو صرف اپنا رازداں سمجھا تھا میں

---

ارے غضب، ارے ستم، وہ اک نگاہِ سحر فن
جھکے اگر تو بت کدہ، اٹھے اگر تو بت شکن

---

یہ عیشِ طرب، یہ رنج و تعب، سب فکرِ نظر کے دھوکے ہیں
دھوکے میں نہ آنا ان کے جگرؔ، یہ راہ گزر کے دھوکے ہیں

---

ہر انقلاب ایک پیامِ سحر سہی　　ہر روشنی دلیلِ طلوعِ سحر سہی

---

دیکھا ہے عشق ہی میں یہ عالم بھی بارہا　　جس کا معاملہ ہو، اسی کو خبر نہ ہو

---

جگرؔ ان حوادث سے گھبرا نہ جانا　　یہی تو ہے دل چسپیوں کا زمانا

---

محبت رہ گئی بن کر مکمل زندگی اپنی　　مبارک بے خودی اپنی، سلامت باخودی اپنی
زمانہ تھا کبھی اپنا، یہ دُنیا تھی کبھی اپنی　　مگر اب تو نہ شامِ غم، نہ صبحِ زندگی اپنی
نگاہیں چار ہوتے ہی طلسمِ ظاہری ٹوٹا　　حقیقت نے حقیقت جان لی، پہچان لی اپنی

---

وہ کیا گئے، بہارِ گلستاں لیے ہوئے　　ہر پھول ہے جراحتِ پنہاں لیے ہوئے
دل بھی وہی ہے، غم بھی وہی، پھر یہ کیا کہ آج　　ہر اشک ہے تبسمِ پنہاں لیے ہوئے

---

بہ شکلِ ناخدا جس میں ہیں اب تک جعفر و صادق
وہ کشتی غرق ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے

---

تو ہلاکِ ہوش و تمکیں، میں شہیدِ کیف و مستی
تری زندگی بھی ہستی، مری زندگی بھی ہستی

ڈگمگانے لگے ہیں پائے طلب
دل ابھی ابتدائے راہ میں ہے
میرے پندارِ عشق پر مت جا
یہ ادا، ناز، گاہ گاہ میں ہے

---

زندگی سلسلۂ دام و قفس ہے ساقی
بندۂ عشق ہوں مجھ کو یہی بس ہے ساقی
وجد میں روح بھی ہے، رقص میں موسیقی بھی
آج کیسا تری آواز میں رَس ہے ساقی

---

جُرمِ جنوں کی اس سے زیادہ کیا ہوگی تعزیر
وحشت کھینچے اپنی جانب، پاؤں پڑے زنجیر
اہلِ زمانہ اور زمانے بھر کی یہ تحقیر
آپ ہی اس میں عیب نکالیں، اپنی ہی تصویر

---

تری شکل جب دل نشیں ہو گئی
محبّت بھی کتنی حسیں ہو گئی

---

رِندی کے لیے ہی نہ عبادت کے لیے ہے
انسان محبّت ہی، محبّت کے لیے ہے

---

پابندِ کرم مائلِ بے داد رہے گی
دُنیائے محبت یونہی برباد رہے گی
میں لاکھ گرانبارِ تعیّن سہی لیکن
فطرت مری آزاد ہے آزاد رہے گی

---

# منظومات

# تجدیدِ ملاقات

مدّت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم — خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم

نغموں میں سمویا ہوا وہ رات کا عالم — وہ عطر میں ڈوبے ہوئے لمحات کا عالم

اللہ رے وہ شدّتِ جذبات کا عالم — کچھ کہہ کے وہ بھولی ہوئی ہر بات کا عالم

چھایا ہوا وہ نشّۂ صہبائے محبّت — جس طرح کسی رندِ خرابات کا عالم

وہ سادگیٔ حُسن، وہ محجوب نگاہی — وہ محشرِ صد شکر و شکایات کا عالم

نظروں سے وہ معصوم محبّت کی تراوش — چہرے پہ وہ مشکوک خیالات کا عالم

عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے وہ قطرے — آنکھوں سے جھلکتا ہوا برسات کا عالم

بے شرطِ تکلّف وہ پذیرائیٔ اُلفت — بے قیدِ تصنّع وہ مدارات کا عالم

ایک ایک نظر شعر و شباب و مے و نغمہ — ایک ایک ادا حُسنِ محاکات کا عالم

وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی دنیا — وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم

نازک سے ترنّم میں اشارات کے دفتر — ہلکے سے تبسّم میں کنایات کا عالم

پاکیزگیٔ عصمتِ جذبات کی دُنیا — دوشیزگیٔ حُسنِ خیالات کا عالم

برہم وہ نظامِ دل و دُنیائے تمنّا
پیہم وہ شکستوں میں فتوحات کا عالم

وہ عشق کی بربادیِ زندہ کا مُرقّع
وہ حُسن کی پایندہ کرامات کا عالم

وہ عارضِ پُرنور وہ کیفِ نگہِ شوق
جیسے کہ دمِ صبحِ مناجات کا عالم

وہ جُراَتِ بیباک، وہ شوخی، وہ شرارت
وہ حسن و محبّت کی مساوات کا عالم

تھک جانے کے انداز میں وہ دعوتِ جُراَت
کھو جانے کی صورت میں وہ جذبات کا عالم

شرمائی، لجائی ہوئی وہ حُسن کی دُنیا
وہ مہکی ہوئی، بہکی ہوئی رات کا عالم

دو بچھڑے دلوں کی وہ باہم صلح و صفائی
پُرکیف وہ تجدیدِ ملاقات کا عالم

وہ عرش سے تا فرش برستے ہوئے انوار
وہ تہنیتِ ارض و سمٰوات کا عالم

تا صبح وہ تصدیقِ محبّت کے نظارے
تا شام وہ پھر فخر و مباہات کا عالم

عالم مری نظروں میں جگرؔ اور ہی کچھ ہے
عالم ہے اگرچہ وہی دن رات کا عالم

# یاد

آئی جب ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

ہر منظرِ جمال دکھاتی چلی گئی
جیسے انھیں کو سامنے لاتی چلی گئی

ہر واقعہ قریب تر آتا چلا گیا
ہر شے حسین تر نظر آتی چلی گئی

ویرانۂ حیات کے ایک ایک گوشے میں
جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی

دل پھنک رہا تھا آتشِ ضبطِ فراق سے
دیپک کو میگھ راگ بناتی چلی گئی

بے حرف و بے حکایت و بے ساز و بے صدا
رگ رگ میں نغمہ بن کے سماتی چلی گئی

جتنا ہی کچھ سکون سا آتا چلا گیا
اتنا ہی بے قرار بناتی چلی گئی

کیفیتوں کو ہوش سا آتا چلا گیا
بے کیفیوں کو نیند سی آتی چلی گئی

کیا کیا نہ حسنِ یار سے شکوے تھے عشق کو
کیا کیا نہ شرمسار بناتی چلی گئی

تفریقِ حسن و عشق کا جھگڑا نہیں رہا
تمئیزِ قرب و بعد مٹاتی چلی گئی

میں تشنہ کامِ شوق تھا، پیتا چلا گیا
وہ مست انکھڑیوں سے پلاتی چلی گئی

اک حسنِ بے جہت کی فضائے بسیط میں
اڑتی گئی مجھے بھی اڑاتی چلی گئی

پھر میں ہوں اور عشق کی بیتابیاں جگرؔ
اچھا ہوا وہ نیند کی ماتی چلی گئی

# سراپا

وہ حسنِ کافر، اللہ اکبر
تخریبِ دوراں، آشوبِ محشر

وہ قدِ رعنا، وہ روئے رنگیں
عالم ہی عالم، منظر ہی منظر

گیسو و عارض، شانہ بہ شانہ
شامِ معطّر، صبحِ منوّر

شرمائیں جن سے ساون کی راتیں
وہ حلقہ ہائے زلفِ معنبر

مینا بدوشے، ساغر بہ چشمے
بر ربط بدستے، مے خانہ در بر

وہ مست نظریں جب اُٹھ گئی ہیں
ٹکرا گئے ہیں ساغر سے ساغر

گفتارِ شیریں خیاّم و حافظ
رفتارِ نازک تسنیم و کوثر

کشور کشائے دل ہائے خوباں
فرماں روائے جاں ہائے منظر

شہکارِ فطرت، اعجازِ قدرت
تعبیرِ خوابِ مانی و آذر

گفتارِ مبہم، اجمالِ ہستی
رفتارِ برہم تفسیرِ محشر

وہ بزمِ خلوت، وہ طرفِ گلشن　　وہ دستِ سیمیں، وہ جامِ احمر
وہ حسنِ رقصاں، وہ جسمِ لرزاں　　وہ عشقِ حیراں، وہ شوقِ مضطر
جانِ توجّہ، روحِ تغافل　　عریاں تبسّم، پوشیدہ نشتر
وہ امتزاجِ شرم و شرافت　　وہ احتیاطِ آداب پرور
وہ موسمِ گل، وہ شیشہ و مُل　　وہ کیف و مستی، وہ رُت، وہ منظر

نغمہ ہی نغمہ، خوشبو ہی خوشبو
صہبا ہی صہبا، ساغر ہی ساغر

(ناتمام)

# قحطِ بنگال

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق، سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں

بچوں کا تڑپنا، وہ بلکنا، وہ سسکنا
ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

بے مہری و بے دردی و افلاس و غلامی
ہے شامتِ اعمال جدھر دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

تعمیر کے پردے میں یہ اندازِ سیاست
تخریب بہ عنوانِ دگر دیکھ رہا ہوں

ہر چند کہ آثار تو کچھ اور ہیں لیکن
اک خیر بھی در پردۂ شر دیکھ رہا ہوں

بیداریِ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بیتابیِ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں

خاموش نگاہوں میں امنڈتے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں

انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن صیّاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں
ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں
اک تیغ کی چشمک سی نظر آتی ہے مجھ کو اک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں
رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّرِ تاباں ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں
بیداری و آزادی و اخلاص و محبت اک خلد در آغوشِ نظر دیکھ رہا ہوں

جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا اب تک
اس خواب کی تعبیر جگرؔ دیکھ رہا ہوں

# پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لیے ہوئے

ہندوستاں میں خیر سے ان کی کمی نہیں
لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لیے ہوئے

دیتے ہیں بات بات پر انسانیت کا درس
دل میں ہزار دشنہ و نشتر لیے ہوئے

بھرے جنونِ حبِّ وطن سے دھوئیں دھوئیں
سینے خباثتوں کا سمندر لیے ہوئے

ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی
باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لیے ہوئے

کہتے ہیں بھائی ہیں یہ اہلِ وطن تمام
پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لیے ہوئے

انسان جس میں بستے ہوں اس طرح کے جگر
بھاگ ایسی سرزمین سے بستر لیے ہوئے

(دورانِ قیام بمبئی سنہ ۱۹۴۶ء)

# آج کل

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے، وہ جو غزل خواں ہے آج کل

سازِ حیات، سازِ شکستہ ہے ان دنوں
بزمِ خیال جنتِ ویراں ہے آج کل

آنکھیں تمام مشہدِ عشق و جمال ہیں
سینہ تمام گنجِ شہیداں ہے آج کل

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل

دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن
اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل

صحنِ چمن میں بوئے وفا کا پتہ نہیں
رنگِ رخِ بہار پرافشاں ہے آج کل

تحصیلِ علم و کسبِ خطابت کے باوجود
تہذیبِ نفس سر بہ گریباں ہے آج کل

کیسا خلوص، کس کی محبت، کہاں کا درد
خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آج کل

افسانہ بن گئی ہیں وسیع الخیالیاں
کم ظرفیِ مزاج نمایاں ہے آج کل

سازش، دغا، فریب، سخن پروری، دروغ
ہر درد کا یہ نسخہ، ارزاں ہے آج کل

اخلاق، ایک فن ہے جو عصرِ جدید میں
اندازِ حسن بن کے نمایاں ہے آج کل

شائستگی کے بھیس میں روحِ درندگی
انساں کے لباس میں شیطاں ہے آج کل

وہ قومیت کہ جس سے ہے انسانیت ذلیل
ہندوستاں میں کس قدر ارزاں ہے آج کل

دہلی و دہرہ دون، نواکھالی و بہار
انساں ہے اور ماتمِ انساں ہے آج کل

ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

تعداد ایک فرقے کی جتنی بھی گھٹ سکے
کارِ ثواب و کارِ نمایاں ہے آج کل

وہ دن گئے کہ طائرِ مقصود تھا شکار
انساں کا شکار خود انساں ہے آج کل

کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادیِ وطن
در اصل ایک پیکرِ بے جاں ہے آج کل

کانٹے کسی کے حق میں، کسی کو گل و ثمر
کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آج کل

سرمایہ داریوں کی طرفداریاں ہیں سب
لیکن مفادِ عام کا عنواں ہے آج کل

ہونے کو یوں تو روز نئی ہیں عنایتیں
اردو زباں پہ خاص کر احساں ہے آج کل

نسبت اب اس کو شاہدِ مستور سے کہاں
شاعر ہے اور پیکرِ عریاں ہے آج کل

کچھ رہبرانِ قوم جو مخلص ہیں واقعی
ان کا چراغ بھی تہِ داماں ہے آج کل

لیکن میں دیکھتا ہوں کہ در پردۂ شہود
فطرت کا انتقام خراماں ہے آج کل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر
وہ مصلحت جو پیشۂ مرداں ہے آج کل

# گاندھی جی کی یاد میں

وہی ہے شورِ ہائے ہو، وہی ہجومِ مرد و زن
مگر وہ حسنِ زندگی، مگر وہ جنّتِ وطن !

وہی زمیں، وہی زماں، وہی مکیں، وہی مکاں
مگر سرورِ یک دلی، مگر نشاطِ انجمن

وہی ہے شوقِ نو بہ نو، وہی جمالِ رنگ رنگ
مگر وہ عصمتِ نظر، طہارتِ لب و دہن

ترقیوں پہ گرچہ ہیں تمدّن و معاشرت
مگر وہ حسنِ سادگی، وہ سادگی کا بانکپن

شرابِ نو کی مستیاں کہ الحفیظ والاماں
مگر وہ اک لطیف سا سرورِ بادۂ کہن

یہ نغمۂ حیات ہے کہ ہے اجل ترانہ سنج
یہ دورِ کائنات ہے کہ رقص میں ہے اہرمن

ہزار در ہزار ہیں اگرچہ رہبرانِ ملک
مگر وہ پیرِ نوجواں، وہ ایک مردِ صف شکن

وہی مہاتما، وہی شہیدِ امن و آشتی
پریم جس کی زندگی، خلوص جس کا پیرہن

وہی ستارے ہیں مگر کہاں وہ ماہتابِ ہند
وہی ہے انجمن مگر کہاں وہ صدرِ انجمن

# آوازیں

اگرچہ صدیاں گزر چکی ہیں، مگر نہ ہے کاروبارِ فطرت
وہی خزاں کا ہے رقصِ عریاں، وہی ہے جشنِ بہار اب بھی

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر، چمن سے روٹھی بہار اب بھی
نسیم ہے آج بھی طرب زا، درخت ہیں سایہ دار اب بھی
مگر وہ انساں کہ جس کے چھونے سے جلتے ہیں برگ و بار اب بھی
انھیں خبر کیا نہیں ہے اس کی، انھیں میں ہیں فتنہ کار اب بھی
گروہ ہیں وقت و مصلحت کے قدیم و تازہ شکار اب بھی
مصیبتوں کو پیامِ عشرت کہ عقل ہے کج روی کی جانب
صعوبتوں کو نویدِ راحت، جنوں ہے آہستہ کار اب بھی

اگرچہ آزادیِ وطن کو گزر چکا ایک سال کامل

مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناسازگار اب بھی

خود اپنی بدنیتی کے ہاتھوں بُرے نتائج بھگت رہے ہیں

صداقتوں سے، حقیقتوں سے وہی ہے لیکن فرار اب بھی

زمین بدلی، زمانہ بدلا، مگر نہ بدلے تو وہ نہ بدلے

جو تنگ و تاریک ذہنیت تھی وہی ہے بر روئے کار اب بھی

یہ زندگی غیر مطمئن سی، شکوک و شبہات کی یہ دُنیا

مگر وہ فرمائے جا رہے ہیں کہ رشتہ ہے استوار اب بھی

کوئی یہ چُپکے سے ان سے پوچھے، کہاں گئے آپ کے وہ دعوے

نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی

سفارشیں ظالموں کے حق میں پیامِ رحمت بنی ہوئی ہیں

نہیں ہے شائستۂ سماعت دُکھے دِلوں کی پکار اب بھی

اِسی کا ہے نام اگر ترقی تو اس ترقی سے باز آئے

کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی

ہمیں مِلا کر بھی خاک و خوں میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک

ہماری خاکِ لحد کے ذرّے ہیں ان کے دامن پہ بار اب بھی

جو مجھ سے جشنِ نظامِ نو ہیں، پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں

یہ جان ہے سوگوار اب تک یہ دل ہے ماتم گسار اب بھی

منافقت کی ہزار باتیں وہ سنتے رہتے ہیں اور خوش ہیں
مگر صداقت کی صاف و سادہ سی بات ہے ناگوار اب بھی

نہ وہ مروّت، نہ وہ صداقت، نہ وہ محبت، نہ وہ شرافت
رہینِ خوف و خطر ہیں یعنی، سکون و امن و قرار اب بھی

زبان و دل میں نہ ربطِ صادق، نہ باہمی وہ خلوصِ کامل
جو تھے غلامانہ زندگی میں وہی ہیں لیل و نہار اب بھی

غلط یہ جمہوریت کے دعوے، دروغ یہ زندگی کے نقشے
دلیل اس کی یہی ہے کافی کہ ذہن ہے تنگ و تار اب بھی

یہ جشنِ آزادیِ وطن ہے مگر اسی جشن و سرخوشی میں
بہت ہیں سینہ فگار اب بھی، بہت ہیں بے روزگار اب بھی

یہی جو سادہ سے قہقہے ہیں، یہی جو پھیکے سے ہیں تبسم
انھیں کی تہہ میں بہت سے اشکوں کے ہیں رواں آبشار اب بھی

ہزارہا انقلاب دیکھے، ہزارہا تجربوں سے گزرے
خرد ہیں تنگی، عمل میں لغزش، جنوں ہے ناپختہ کار اب بھی

یہ رشوتوں کی، یہ سازشوں کی، یہ نفع اندوزیوں کی لعنت
وہ خود ہی انصاف سے یہ کہہ دیں نہیں وہ کچھ ذمہ دار اب بھی

انھیں کے حلقوں سے خود انھی کی مخالفت عام ہو رہی ہے
ہماری جانب سے لیکن ان کی نظر ہے بے گانہ وار اب بھی

کہاں کی دلداری و محبت، تلافیوں کا تو ذکر ہی کیا
حقوق پامال کر رہے ہیں حقوق کے پہرہ دار اب بھی

کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی، مسرت آزادیوں کی حاصل
کہ عام انسانیت کا عالم ہے تشنہ و بے قرار اب بھی

وسیع مسلک، رفیع فطرت، خلوصِ ایماں، خلوصِ نیت
انھیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی

زمانہ کیا کیا نہ کہہ چکا ہے، زمانہ کیا کیا نہ کہہ رہا ہے
مگر وہ ہیں وضع دار ایسے، ذرا نہیں شرمسار اب بھی

خلوصِ نیت سے صرف اپنی ہی زندگی پر کریں توجہ
خلوصِ نیت کی منتظر ہے سعادتِ کردگار اب بھی

کبھی کبھی غور کرتے رہیے، جگر کا مصرع یہ پڑھتے رہیے
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن کی روٹھی بہار اب بھی

جگر کی ہے زندگی محبت، نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت
جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

# گزر جا

بازیچۂ اربابِ سیاست سے گزر جا  
اس کارگہِ مکر و ضلالت سے گزر جا

ہر عشرتِ بے دقّت و محنت سے گزر جا  
جنّت سے گزرنا ہی تو جنّت سے گزر جا

جرأت ہی تو ہر نیم صداقت سے گزر جا  
ہمّت ہے تو محدود محبّت سے گزر جا

ہر تنگ نظر اہلِ صحافت سے گزر جا  
ہر سادہ و پرکار عبارت سے گزر جا

الفاظ نہیں، دام ہیں یہ مکر و دغا کے  
زورِ قلم و جوشِ خطابت سے گزر جا

خودداریِ بے باک شرافت کا ہے جوہر  
اظہارِ وفا، جوشِ عقیدت سے گزر جا

تا چند یہ توہینِ حقوقِ مدنیّت  
اٹھ اور اب اس قعرِ مذلّت سے گزر جا

سر تا بہ قدم پیکرِ ایثار و عمل بن  
ہر مرحلۂ شکر و شکایت سے گزر جا

کرنا ہے اگر کارِ نمایاں کوئی تجھ کو  
اٹھ اور ہر آسانیِ لذّت سے گزر جا

قسمت تری خود ہے ترے کردار میں مضمر  
قسمت کو بنانا ہے تو قسمت سے گزر جا

جینا ہے جو منظور تو جینے کی نہ کر فکر — راحت کی تمنا ہے تو راحت سے گزر جا

جو صبر و قناعت تجھے مفلوج بنا دے — بہتر ہے کہ اس صبر و قناعت سے گزر جا

پیدا نہ کرے تجھ میں جو پاکیزگیِ روح — اس فلسفہ و دانش و حکمت سے گزر جا

نادار کی مجبوری و پستی کی طرف دیکھ — ہر قصر فلک بوس کی رفعت سے گزر جا

جھلسے ہوئے اجسام سسکتی ہوئی روحیں — کچھ سوچ کے اس منظرِ عبرت سے گزر جا

ہر لمحہ یہاں جہدِ مسلسل کا ہے پیغام — اے ننگِ طلب، وقفۂ راحت سے گزر جا

دنیا کہ ہے اک رزم گہہِ شیطنت و حق — لڑتا ہوا ہر کفر و ضلالت سے گزر جا

سیدھی سی بس اک راہِ صداقت پہ چلا چل — پر پیچ گزرگاہِ سیاست سے گزر جا

انسانیتِ عام کے مرکز کی بنا ڈال — ہر ناقص و محدود جماعت سے گزر جا

اوروں کے لیے چھوڑ یہ تاریک مقامات — نفرت سے، عداوت سے، شقاوت سے گزر جا

لیتا ہوا اک درسِ حیاتِ ابدی کا — ہر تازہ غم و رنج و مصیبت سے گزر جا

حق پر ہے اگر تو، تو شہادت کا مزہ چکھ — بچ کر نہ اس آشوبِ ہلاکت سے گزر جا

ہے خدمتِ مخلوق ہی نعم البدل اپنا — کر خدمتِ مخلوق، تجارت سے گزر جا

ملت کی بقا ہے تری اس موت میں پنہاں — سر دے کے تو میدانِ شہادت سے گزر جا

سرمایہ و سازش کے یہ مردود عزائم — تو صرف اک اندازِ حقارت سے گزر جا

توحید کی طاقت کو بنا اپنا معاون — ہر واہمۂ ملت و کثرت سے گزر جا

حائل ہو قیامت بھی اگر راہ میں تیری — ٹھکرا کے قیامت کو قیامت سے گزر جا

بے باک گزر رزم گہہِ دہر سے لیکن — مقصد یہ نہیں فہم و فراست سے گزر جا

تو حسن کے اِک دائرۂ کُل کی طرف آ
ہر جزوی و محدود حقیقت سے گزر جا

کونین تری وسعت و رفعت میں ہیں خود محو
کونین کی ہر وسعت و رفعت سے گزر جا

تجھ پر جو گروہِ جُہلا طنز کرے کچھ
با رُعب و دلآویز متانت سے گزر جا

ہوتی ہے یوں ہی نشو و نما فکر و عمل کی
ہنستا ہوا ہر جبرِ حکومت سے گزر جا

انسان بن انسان، یہی ہے تری معراج
رنگ و وطن و قوم کی لعنت سے گزر جا

تیرے یہ پیامات جگرؔ، ہم کو مبارک
تو بھی تو اب اس پستیِ عزلت سے گزر جا

# نوائے وقت

اُٹھو اُٹھو کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے
بڑھو بڑھو کہ چارسُو پکار ہی پکار ہے

وہ وقت ہے کہ علمِ حق ہے علمِ شیطنت میں گم
وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

کہاں کے مطرب و غزل، کہاں کے شاہد و چمن
کہ زندگی تمام تر بساطِ کارزار ہے

غضب! کہ چھائی جا رہی ہیں ظلمتوں کی بدلیاں
ستم، کہ زد میں آندھیوں کی شمعِ روزگار ہے

زمیں کو روندتے ہوئے، صفوں کو چیرتے ہوئے
بڑھے چلو، بڑھے چلو، یہ وقت کی پکار ہے

# زمانے کا آقا غلامِ زمانہ

کدھر ہے تو اے جرأتِ باغیانہ
بدل دے مقدر پلٹ دے زمانہ

کھلا بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل
کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ

محبت اُڑی جا رہی ہے دلوں سے
حقیقت بنی جا رہی ہے فسانہ

شرافت کا معیار، افراطِ دولت
صداقت کی معراج، لفظی ترانہ

زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے
مگر طینتیں بیشتر مفسدانہ

غریبوں پہ جو کچھ گزرتی ہے گزرے
سمٹ آئے جیبوں میں لیکن خزانہ

تبسم خود اک پیکرِ مادّیت
مگر درسِ روحانیت عارفانہ

دلائل کی ہنگامہ آرائیوں میں
کہیں روح بسمل، کہیں دل نشانہ

نتائج سے بھی آنکھ کھلتی نہیں ہے
ہر اقدام اب تک ہے نامنصفانہ

بشر کی یہ پستی ارے توبہ توبہ
زمانے کا آقا غلامِ زمانہ

# دلِ حسیں ہے تو محبّت بھی حسیں پیدا کر

پہلے تو حسنِ عمل، حسنِ یقیں پیدا کر
پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر

یہی دُنیا کہ جو بُت خانہ بنی جاتی ہے
اسی بُت خانے سے کعبے کی زمیں پیدا کر

روحِ آدم نگراں کب سے ہے تیری جانب
اٹھ اور اک جنّتِ جاوید یہیں پیدا کر

خس وخاشاکِ توہّم کو جلا کر رکھ دے
یعنی آتش کدۂ سوزِ یقیں پیدا کر

غم میسّر ہے تو اس کو غمِ کونین بنا
دل حسیں ہے تو محبّت بھی حسیں پیدا کر

آسماں مرکزِ تخئیل و تصوّر کب تک
آسماں جس سے خجل ہو وہ زمیں پیدا کر

دل کے ہر قطرے میں طوفانِ تجلّی بھر دے
بطنِ ہر ذرّہ سے اک مہرِ مبیں پیدا کر

بندگی یوں تو ہے انسان کی فطرت لیکن
ناز جس پر کریں سجدے وہ جبیں پیدا کر

پستیِ خاک پہ کب تک تری بے بال و پری
پھر مقام اپنا سرِ عرشِ بریں پیدا کر

عشق ہی زندہ و پائندہ حقیقت ہے جگر
عشق کو عام بنا، ذوقِ یقیں پیدا کر

# اعلانِ جمہوریت

(۲۶ر جنوری سنہ ۱۹۵۰ء)

خدا کرے کہ یہ دستور ساز گار آئے
جو بے قرار ہیں اب تک انھیں قرار آئے

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے
کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ بھی نکھار آئے

وہ سرخوشی ہو کہ خود سرخوشی بھی رقص کرے
وہ زندگی ہو کہ خود زندگی کو پیار آئے

کھلے جو پھول تو دے جسمِ ناز کی خوشبو
کلی اگر کوئی چٹکے صدائے یار آئے

---

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں
کہیں بہار نہ آئے، کہیں بہار آئے

یہ مے کدے کی، یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بہ کف، کوئی شرمسار آئے

مذاقِ عشق بدل دے مزاج کون و فساد
دلوں تک آئے جو غم بھی تو خوش گوار آئے

نظامِ خلق و مروّت کبھی جو برہم ہو
نگاہِ لطف و محبت بڑھے سنوار آئے

دلوں پہ نقش نہ رہ جائے کوئی نفرت کا
یہ فتنہ بن کے نہ آشوبِ روزگار آئے

برائی کرنے سے پہلے ہی کاش انساں کو
نظر ہر ایک بدی کا مآلِ کار آئے

وہ حادثاتِ زمانہ سے محو ہو جائیں
کہ جن کے ذکر سے انسانیت کو عار آئے

نمائشی ہی نہ ہو یہ نظامِ جمہوری
حقیقتاً بھی زمانے کو سازگار آئے

---

خلوص و عدل و مساوات دل میں گھر کر لیں
نہ یہ کہ ذکر زباں پر ہی بار بار آئے

ضمیر صاف ہو اپنا تو غیر ممکن ہے
کسی کے آئینۂ قلب پر غبار آئے

محبّت آج بھی مشعل فروزِ منزل ہے
اگر نہ کور نگاہی بروئے کار آئے

دلوں کی کھوٹ ہو جس کے خمیر میں شامل
نہ آئی ہے وہ سیاست نہ سازگار آئے

زبان و دل میں بہم ارتباط ہو ایسا
کہ جو زبان کہے، دل کو اعتبار آئے

بنا دیا ہے محبّت نے آگ کو گلزار
مگر جو آج کے انساں کو اعتبار آئے

نہ ہو جو عام مسرّت، محال ہے اے دوست
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

---

# ساقی سے خطاب

"ساقی" اور "رند" دونوں مے خانۂ روحانیت سے وابستہ ہیں۔ دونوں میں شدید محبت ہے۔ جہاں ساقی عظیم المرتبت ہے وہاں رند بھی معمولی رند نہیں بلکہ ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ عصرِ جدید کے حالات سے متاثر ہو کر رندِ مے خانہ کی زندگی ترک کرنا اور جد و جہد کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتا ہے اور ساقی سے اجازت کا طالب ہوتا ہے۔

ساقی کو خیال ہوتا ہے کہ عمل کی دنیا میں خدا جانے رند سے کیا کیا لغزشیں ہوں لیکن رند پر ساقی کا احساس منکشف ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہہ کر ساقی کو مطمئن کرنا چاہتا ہے ؎

نہ لاؤ سوا اس نسل میں جو ہیں تیرے نشے کھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

اسی کے ساتھ نظم میں "معیارِ جنوں"، "تنظیمِ میخانہ"، "انسان" اور "انسانیت"، "وطن" اور "وطنیت" وغیرہ وغیرہ کے متعلق بھی رند یعنی شاعر کے نظریات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

سلامت تو، ترا مے خانہ، تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موج زن ساقی

کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل، توبہ شکن مے کش
مگر بننا ہے اب خنجر بہ کف، ساغر شکن ساقی

نہ لا وسواس دل میں، جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

جو دشمن کے لیے بھی سر سے اپنے کھیل جاتے ہیں
دلِ خوباں میں چبھتا ہے انھیں کا بانکپن ساقی

ترے جوشِ رقابت کا تقاضا کچھ بھی ہو، لیکن
تجھے لازم نہیں ہے ترکِ منصب دفعۃً ساقی

ابھی ناقص ہے معیارِ جنوں، تنظیمِ مے خانہ
ابھی نا معتبر ہے تیرے مستوں کا چلن ساقی

وہی انساں، جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی خود سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

لباسِ حرّیت کے اڑ رہے ہیں ہر طرف پرزے
بساطِ آدمیّت ہے شکن اندر شکن ساقی

مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی میں
بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و فن ساقی

کہیں ملحد نہ بن جائیں مرے افکارِ سنجیدہ
کہیں مرتد نہ ہو جائے مرا ذوقِ سخن ساقی

کہیں خود حسن رہ جائے نہ قومی ملکیت بن کر
کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدودِ وطن ساقی

کہاں میں رندِ سرگشتہ، کہاں یہ دعوئے تمکیں
سمجھ لے اس کو بھی میرا اِک اندازِ سخن ساقی

عجب کیا ہے یہ بہکی بہکی باتیں رنگ لے آئیں
بہت باہوش رہتا ہے مرا دیوانہ پن ساقی

نمودِ صبحِ کاذب ہی دلیلِ صبحِ صادق ہے
اُفق سے زندگی کی دیکھ وہ اُبھری کرن ساقی

بدہ جامِ مے باقی کہ در جنّت نہ خواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گل گشتِ چمن ساقی

# نذرِ غالب

اے وہ کہ تری ذاتِ گرامی بہ ہمہ رنگ
قدرت کی جو ہمراز تو فطرت کی ہم آہنگ

اے وہ کہ ہر اک نغمہ ترا نغمۂ فطرت
اے وہ کہ ہر اک نقش ترا درکشِ ارژنگ

اے وہ کہ ترے معجزۂ جنبشِ لب سے
اک جنتِ شاداب ہر اک غنچۂ دل تنگ

اے وہ کہ تری فکر بہ ہر طرز و بہ ہر صنف
ہم شعلہ و ہم شبنم و ہم شیشہ و ہم سنگ

اقلیمِ سخن ہے ترے اعجازِ نفس سے
ہم نغمہ و ہم دشنہ و ہم نکہت و ہم رنگ

ہر پھول ترے باغ کا فردوس بہ دامن
ہر خار ترے دشت کا انگشتہ بہ شفق رنگ

اک گوشۂ دامن میں مرے دجلہ و جیحوں
اک موجِ نفس میں تری رقصاں چمن و گنگ

تو نظم میں بھی نثر میں بھی مجتہد العصر
لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی ہو نظر تنگ

تو نے اسے گنجائشِ کونین عطا کی
ہر چند بہت تھا ابھی دامانِ غزل تنگ

لاریب کہ اس ذات سے واقف تھی تری ذات
افسانہ ہمہ رنگ و حقیقت ہمہ بے رنگ

الحق کہ تری وسعتِ تخئیل کے آگے
صحرا کفِ خاکستر و گلشن قفسِ رنگ

# گیت

(ایک آزاد مملکت وطن کے ایک نو وارد مسافر سے)

## شاعر کا خطاب

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
بھاگ مسافر بھاگ ..................!
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

---

دیس کے اپنے کرتا دھرتا اکثر ہیں وہ لوگ
دل ہیں جن کے کنکر پتھر فطرت جن کی گھاگ
بھاگ مسافر بھاگ ..................!

گاندھی جی کا نام زباں پر من کے اندر روگ
کام نہیں ہے جھانسا پٹی، بات نہیں بے لاگ
بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

---

جنتا جاہل ننگی بھوکی اور یہاں کچھ لوگ
اپنے اپنے رنگ محل میں بیٹھے اڑائیں کاگ
بھاگ مسافر بھاگ.................!
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ
بھولی بھالی صورت والے بوٹ ہیں بس کی پوٹ
گوری چٹی رنگت والے ناگ ہیں کالے ناگ
ناگ ہیں کالے ناگ مسافر، ناگ ہیں کالے ناگ
بھاگ مسافر، بھاگ مسافر، بھاگ مسافر بھاگ
میرے وطن سے، میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

---

کوچے کوچے، گوشے گوشے، لوٹ مچی ہے لوٹ
جنگل جنگل بستی بستی آگ لگی ہے آگ
بھاگ مسافر بھاگ.................!

میرے وطن میں سیل محبت، فرض کا عام احساس
میرے وطن میں پھوٹ عداوت، اپنے اپنے بھاگ
بھاگ مسافر بھاگ...............!

---

ہولی آئی ہولی آئی، اب ہے یہاں یہ ریت
دولت چھینیں، عصمت لوٹیں، خون سے کھیلیں پھاگ
خون سے کھیلیں پھاگ مسافر، خون سے کھیلیں پھاگ
بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ

آزادی کی بھیک سے ملتا آخر کیا انعام
فتنے جاگے، بھیرو ناچا، موت نے چھیڑا راگ
موت نے چھیڑا راگ مسافر، موت نے چھیڑا راگ
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ

# قند پارسی

بسرِ تو ساقیِ مستِ من، بہ سرورِ بے طلبی خوشم
رم شراب نمی دہی، بہ خمارِ تشنہ لبی خوشم

چہ خوش است ذوقِ محبتم! چہ بلاست لذتِ فرقتم
کہ بہ یادِ زلفِ سیاہِ تو، بہ ہجومِ تیرہ شبی خوشم

بہ مقامِ عشق وچہ منزلے کہ دریں زماں منِ بے دِلے
بہ شاہدے، نہ بہ مطربے، نہ بہ حاصلِ عنبی خوشم

ز نگاہِ عشوہ طرازِ تو، چہ گزشت بر دلِ من کہ من
نہ بہ نالۂ سحری خوشم، نہ بہ آہِ نیم شبی خوشم

ز جفائے حسنِ تمامِ تو نہ حکایتے نہ شکایتے
چہ حکایتے چہ شکایتے کہ بہ ترکِ بے ادبی خوشم

---

همه هوشِ عشقم، همه سوزِ جانم — حذر اے جواناں! که پیرِ جوانم

نه اسمم نه جسمم نه اینم نه آنم — چه رازِ عیانم! چه سرِّ نهانم

جهاں از من و من به جانِ محبّت — به جانِ محبّت! که جانِ جهانم

خوشا نسبتِ عشقِ لافانیِ تو

فنا گشتم و زنده جاودانم

# نعت شریف

اے از لبِ صادقت شنیدہ — نادیدہ خدا، خدائے دیدہ

## خصوصیاتِ محمدیہ

اے مثلِ تو در جہان نگارے — یزداں دگرے نہ آفریدہ
اے آں کہ بہ "امتزاجِ کامل" — در جملہ صفات برگزیدہ
تو پرتوِ حسنِ ذات و از تو — یک شمّہ بہ دیگراں رسیدہ
اے بے ہمہ خلق و باہمہ خلق — اے از ہمہ خلق برگزیدہ

## عہدِ رسالت تا خلافتِ راشدہ

آں خیر کہ بود در زمانت — بعد از تو زمانہ ہم نہ دیدہ
در عشق و وفا دگر مثالے — نے دیدہ و نے زکس شنیدہ

## عہدِ حاضر

امروز بہ بیں کہ مردماں را — کارے بہ ہلاکتے رسیدہ
مشرق ہمہ پُر ز فتنہ و شر — مغرب ہمہ مست و سرکشیدہ

## معراج

اے آں کہ ز شوقِ بے نہایت — حق را ہمہ آشکار دیدہ
طے کردہ مراحل و منازل — تا سِدرَہ بہ ساعتے رسیدہ
وز سِدرَہ بہ منتہائے قوسین — با عظمتِ خاص رہ بریدہ

## شمہ از حقیقت معراج

ای آں کہ درونِ پردۂ راز — از خویش بہ خویشتن رسیدہ

---

کے عقل تواں رسد بہ پایاں — ہم عشق ہنوز نارسیدہ
"لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکْ" — در مدحِ تو جانِ ہر قصیدہ
اے اسمِ تو حرزِ جانِ عشاق — اے ذکرِ تو نورِ قلب و دیدہ
اے بر تو نثار "شرمِ عصیاں" — اے بر تو فدا "دلِ تپیدہ"
یک گوشۂ چشمِ التفاتے — بر اُمتیانِ غم رسیدہ
رحمت بہ اشارۂ توجوشاں — جنّت بہ نگاہت آرمیدہ

## قطع و مقطع

استادہ بہ پیش بارگاہت — پیرے بہ رُخ آستیں کشیدہ
شاید جگرے حزیں ہمیں است — از بارِ گنہ کمر خمیدہ

# حقیقت و مجاز

اے عینِ تو ہیچ کس ندیدہ | افسانہ بہ ہر زباں رسیدہ
دیدن نتواں واز رہِ شوق | خارے بہ دلے جہاں خلیدہ
عالم ہمہ پر ز جلوۂ دوست | اے وائے نگاہِ نارسیدہ
گہ گہ نگہے بہ پائمالاں | اے سروِ رواں بہم کشیدہ
دارد کم شے بہ سینۂ عشق | نازک ز گلِ بہار چیدہ"
جامے ز مے کشیدہ ساقی | کیفِ ز شرابِ ناکشیدہ

## قطعہ (مجاز و محاکات)

دی شب بہ کنارم آمداں شوخ | دامانِ حیا بہ رخ کشیدہ
یک پیکرِ حسن و شعر و نغمہ | یک صنعتِ قدرت آفریدہ
یک حسنِ نگار و صد بہاراں | یک شوقِ من و ہزار دیدہ
گل تمکنتے بہ رخ فروزاں | خوش معذرتے بہ لب رسیدہ
آں دیدۂ شرمگیں کہ گوئی | مے خانہ بہ ساغرے کشیدہ
پنہاں نظرے بہ شوقِ گستاخ | پیدا اثرِ دلِ تپیدہ

---

لہ "گل"، ہر ایسے محل پر جب مسرت و احترام کا مقصود ہو، اہلِ فارس کا محاورہ ہے مثلاً گل آری۔ گل گفتنی وغیرہ

مژگانِ دراز صف بہ بستہ
ابروے سیہ کماں کشیدہ

جنبش بہ نگاہِ ناتمامے
لرزش "بہ لبے سخن رسیدہ"

ہم سطوتِ حسن، بہرِ تادیب
ہم ناز، نیاز آفریدہ

از جوشِ خلوص، مہر بر لب
وز کیفِ نشاط، آبدیدہ

گفتم کہ چساں گزشت بے من
گفتا، بہ خیالت آرمیدہ

## قطعہ

اے آں کہ ز عشق پرسی از من
عشق است نہالِ برگزیدہ

بیخش بہ دلِ ازل نہفتہ
شاخش بہ سرِ ابد رسیدہ

# کلامِ تازہ

(یہ غزلیں آتشِ گل کی اشاعت کے بعد کہی گئی ہیں)

کم نہیں ظلمت بھی کچھ، اہلِ نظر کے لیے
کون رہے شب نشیں نورِ سحر کے لیے

لاکھ چمن زارِ حسن پیشِ نظر ہوں تو کیا
ہاتھ یہ بڑھتے نہیں ہر گلِ تر کے لیے

جس پہ بہت ناز ہے آہ، تجھے بوالہوس
ننگ ہے وہ زندگی اہلِ نظر کے لیے

جوشِ طلب چاہیے ہوشِ ادب چاہیے
بند نہیں کوئی راہ پائے بشر کے لیے

رقص میں ہے زندگی ایک ترے واسطے
وجد میں ہے کائنات اہلِ نظر کے لیے

کم نہ ہوئیں ظلمتیں اُف رے شبستانِ غم
بجھ گئے لاکھوں چراغ، ایک سحر کے لیے

گونڈہ - جون ۱۹۵۸ء

---

محبت کا بالآخر رقصِ بیتابانہ کام آیا
نگاہِ شرمگیں اُٹھی، سلام آیا، پیام آیا

نہ جانے آج کس دھن میں زباں پر کس کا نام آیا
فضا نے پھول برسائے، ستاروں کا سلام آیا

ادب اے گردشِ گردوں کہ پھر گردش میں جام آیا
سنبھل اے عہدِ تاریکی کہ وقتِ انتقام آیا

جہادِ زندگی میں جب کوئی نازک مقام آیا
جنوں ہی نے قیادت کی، خلوصِ غم ہی کام آیا

نئی تخریب لازم ہے نئی تعمیر کی خاطر
ہوا کیا تو اگر کچھ گرتی دیواروں کو تھام آیا

مجھے شکوہ نہیں ساقی سے اپنی تشنہ کامی کا
مری قسمت میں دل آیا ترے حصے میں جام آیا

اندھیروں سے اجالے پھوٹ نکلے، دل یہ کہتا ہے
مرا افسوں خرام آیا، مرا ماہِ تمام آیا

سنبھل کر یوں تو ہم گزرے کسی کی راہ میں لیکن
کچھ ایسے بھی مقام آئے کہ گرنا ہی کام آیا

اٹھا تعظیم کو ساقی، جھکے شیشے، بڑھے ساغر
نہ جانے آخرِ شب کون رندِ تشنہ کام آیا

نکل آیا جگر جب میکدے میں شور یہ اٹھا
وہ رندِ دل بیمار و مے بجام و تشنہ کام آیا

گونڈہ۔ جولائی ۱۹۵۸ء

---

منصور ہر اک دور میں بیدار ہوا ہے
افسانہ کہیں ختم سرِ دار ہوا ہے

مدت ہوئی جو اس شوخ کا دیدار ہوا ہے
تا دیر سنبھلنا مجھے دشوار ہوا ہے

بے نام و نشاں ایسا بھی اک وار ہوا ہے
ہر عزم، ہر اک حوصلہ بیکار ہوا ہے

کیا کیا نہ تپایا ہے اسے آتشِ غم نے
تب جا کے یہ دل شعلۂ بیدار ہوا ہے

اب حسن سے کچھ کام نہ جلووں سے سروکار
اب عشق ہی خود عشق کا معیار ہوا ہے

فیضانِ غمِ دوست سے حاصل ہے وہ نسبت
ہر سانس حدیثِ لب و رخسار ہوا ہے

کچھ دل کا تقاضا ہی نہ تھا "عرضِ محبت"
کچھ ان کی نگاہوں کا بھی اصرار ہوا ہے

بے شاہد و ساقی بھی کبھی پی تو ہے لیکن
جو گھونٹ بھی اترا ہے وہ تلوار ہوا ہے

ڈھانی ہے اسی کو غمِ دوراں پہ قیامت
یہ دل جو ابھی فتنۂ بیدار ہوا ہے

کچھ دن سے عجب دل کی نزاکت کا ہے عالم
اک حرفِ تسلّی بھی گراں بار ہوا ہے

شبنم کی نظر میں نہیں تخصیص کسی کی
سیراب ہر اک پھول ہر اک خار ہوا ہے

کیا چیز تھی رندانِ خوش انفاس کی صحبت
سنتے ہیں کہ واعظ بھی قدح خوار ہوا ہے

کیا کہیے جگر کس گلِ رعنا کی بدولت
ہر شعر مرا شعلۂ رخسار ہوا ہے

گونڈہ اگست ۱۹۵۸ء

---

یہ میخانہ ہے بزمِ جم نہیں ہے
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

شکستِ دل شکستِ غم نہیں ہے
مجھے اتنا سہارا کم نہیں ہے

ذرا سا دل ہے لیکن کم نہیں ہے
اسی میں کون سا عالم نہیں ہے

یقینِ عشق اگر محکم نہیں ہے
کوئی عالم بہ ہر عالم نہیں ہے

نہ جا شانِ تغافل پر کہ اے دوست
مقامِ التجا بھی کم نہیں ہے

تو پھر کیا ہے اگر یہ حسنِ فطرت
مآلِ لغزشِ آدم نہیں ہے

کہاں کا حسن اگر اٹھ جائے پردہ
حقیقت کیا اگر مبہم نہیں ہے

ستم کچھ اور کر لیں حسن والے
مزاجِ عشق اگر برہم نہیں ہے

ارے او شکوہ سنجِ عمرِ فانی
یہ فانی زندگی بھی کم نہیں ہے

وفا اک جنس ہے معروف و دلکش
مگر یہ فطرتِ آدم نہیں ہے

نگاہ و فکر کو کیا کہیے ورنہ
حقیقت کوئی بھی مبہم نہیں ہے

زباں سے کوئی کچھ کہہ لے پرائے دوست
کہیں ایثارِ غم جاتا ہے ضایع

تسلیم کس کا خم نہیں ہے
چمن شاداب ہے، شبنم نہیں ہے

(گونڈہ۔ مارچ ۱۹۶۵ء)

---

کیا چیز غمِ عشق کی دیوانہ وشی ہے
رونا ہے تو رونا ہے، ہنسی ہے تو ہنسی ہے

ہر چند کہ تکرارِ نظر بے ادبی ہے
پر کیجیے کیا، عشق کی فطرت ہی یہی ہے

آسان نہیں جہدِ مسلسل سے گزرنا
ہر گام یہاں مرحلۂ خود شکنی ہے

اک طرزِ تصوّر کے کرشمے ہیں بہ ہر رنگ
اے دوست یہ دنیا نہ بری ہے نہ بھلی ہے

اک منزلِ بے نام نہ حسرت نہ تماشا
اک عالمِ حیرت کہ نہ غم ہے نہ خوشی ہے

بن جاؤں نہ بیگانۂ آدابِ محبت
اتنے نہ قریب آؤ، مناسب بھی یہی ہے

وہ ظلم بھی کرتے ہیں تو فرماتے ہیں احساں
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو خاطر شکنی ہے

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حسن
جب دیکھیے کچھ نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

---

له یہ شعر "شعلۂ طور" میں شایع ہو چکا ہے اور اب اس غزل میں شامل کر لیا گیا ہے۔

# دو غیر مطبوعہ غزلیں

جگرؔ صاحب کے انتقال کے بعد یہ دو غیر مطبوعہ غزلیں اور دستیاب ہوئیں۔ مرحوم اپنی علالت کے سبب غالباً ان پر نظرِ ثانی نہیں کر سکے۔ اس لیے یہ کہیں اشاعت کے لیے بھی نہیں بھیجی گئیں۔

(۱)

اب کسی شے میں دل کشی نہ رہی — رہ گیا سایہ روشنی نہ رہی
کہنے سننے کا جب مقام آیا — کہنے سننے کی تاب ہی نہ رہی
رشک نے ایسے تفرقے ڈالے — دیدہ و دل میں دوستی نہ رہی
رہ گیا کیا اگر محبت میں — سر فروشانہ زندگی نہ رہی
عشق ہی درد، عشق ہی درماں — اب ضرورت کسی کی بھی نہ رہی
ہم نہ تھے گرچہ مستحقِ کرم — اس طرف سے مگر کمی نہ رہی
لوٹ لے دولتِ فراق جگرؔ — فرصتِ غم رہی رہی نہ رہی

(۲)

آج روش روش یہی سُنتا ہوں اِک کلام سا
صحنِ چمن میں کون ہے جو نہیں تشنہ کام سا

میرے نفس نفس میں یہ کون ہے خوش خرام سا
جیسے کہ ذرّہ ذرّہ ہے مجھ سے ہی ہم کلام سا

حسن کی ہر نگاہ میں، حسن کے ہر سکوت میں
کوئی نہ کوئی رمز سی ایک نہ اِک پیام سا

وصل و فراق سے بلند، عیش و الم سے بے نیاز
ہے مری چشمِ شوق میں ایسا بھی اک مقام سا

امن و سلامتی کا شور، جنگ و جدال سے گریز
یہ بھی ہے اک گرفت سی، وہ بھی ہے ایک دام سا

اس کی حریمِ ناز میں کون اب اس طرح سے جائے
روح بھی شمعِ کشتہ سی، دل بھی شکستہ جام سا

زخمِ فراق و داغِ عشق، کم نہیں یہ بھی نعمتیں
ایک شگفتہ پھول سا، ایک مہِ تمام سا

مستی و ہوش اگرچہ ہوں اپنے کمال پر مگر
یہ بھی کہاں مقامِ دل، ہوگا کوئی مقام سا

ISBN : 978-81-7587-810-5

9 788175 878105


₹ 100/-